خونی بولی
اشتیاق احمد

محمود • فاروق • فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز

ناول نمبر ۳۶۴

خونی بولی

اشتیاق احمد

نام ناول ——— خونی بولی
طابع ——— اشتیاق احمد
خوشنویس ——— سعید نامدار
سرورق ——— محمد مقصود خنید
قانونی مشیر ——— شمیم احمد ایڈووکیٹ
مطبع ——— افضل شریف پرنٹرز
قیمت ——— ۱۸ روپے
سالانہ قیمت ایک ناول ——— ۲۵۰ روپے
سالانہ قیمت دو ناول ——— ۴۵۰ روپے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، قنطار (جس کا ذکر قرآن میں ہے) بارہ ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ہر اوقیہ بہتر ہے اس سے جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے (اس میں اشارہ ہے اس قنطار کی طرف جو دُوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی رات کو ہزار آیتیں کھڑے ہو کر پڑھے تو وہ قنطار والوں میں سے لکھا جائے گا۔ یہ ابوداؤد نے عبد اللہ بن عمرو سے نکالا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ آدمی کا درجہ جنت میں بلند کیا جاتا ہے (اس کے مرجانے اور جنت میں درجہ معین ہو جانے کے بعد) وہ کہتا ہے، میرا درجہ کیسے بلند ہوگیا (حالانکہ عمل کا کوئی موقع نہیں رہا) اس کو جواب دیا جاتا ہے کہ تیرے بچے کی دُعا کے سبب سے (یعنی تیرے لیے تیری اولاد نے دُعا کی، اس وجہ سے تیرا درجہ بلند ہوا۔ اولاد صالح بڑی نعمت ہے حق تعالیٰ کی کہ موت کے بعد بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے، وہ باقیات

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

آخری فیصلہ

وُہ گلی سے نکل کر جُونہی چوک کی طرف آیا، کسی نے اسے گدی سے پکڑ لیا:

"اے مسٹر۔ کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ آج بچ کر نہیں جا سکو گے، ہر طرف ناکہ بندی کی جا چکی ہے۔" گدی سے پکڑنے والے نے سخت لہجے میں کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ آپ۔ آپ کون ہیں؟" یہ کہ کر اس نے گردن گھمانے کی کوشش کی، اتنے میں سامنے سے ایک کانسٹیبل نے آ کر اس کے پیٹ میں ایک مُکّا دے مارا۔

"اوہ۔" وہ دہرا ہو گیا۔ پھر چلّایا:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری۔ آج نہیں بچو گے بچّو۔" دُوسرا ہنسا۔

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟"

"ابھی پتا چل جاتا ہے ۔ وہ دیکھو، سب انسپکٹر صاحب آ رہے ہیں۔"

"سب انسپکٹر صاحب آ رہے ہیں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! آخر آج ہم نے کامیاب چھاپہ مار ہی لیا ۔ ہمارے وارے نیارے ہو ہی گئے۔"

"پتا نہیں، آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

"کیسا انجان بن رہا ہے؟"

اتنے میں لمبے قد کا سب انسپکٹر نزدیک آ گیا، آتے ہی اس نے اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی ۔

"اُف ۔ یہ ہو کیا رہا ہے ۔ آپ لوگ مجھے کیوں مار رہے ہیں؟"

"لوگوں کو ہیروئن کے نشے پر لگا رہے ہو اور پوچھ رہے ہو ۔ مجھے کیوں مار رہے ہیں ۔ تم جیسوں کو تو بغیر مقدمے کے پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے۔"

"ہیروئن۔" وہ چلایا، پھر حلق پھاڑ کر بولا:

"نن ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ جھوٹ ہے۔"

"اور یہ تمھارے ہاتھ سے کیا چیز نیچے گر پڑی ہے؟" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

اس نے چونک کر سڑک پر دیکھا، وہاں چند پڑیاں

بکھری ہوئی تھیں ۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ہیروئن کی کسی پڑیا کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا، لیکن اب اس کے قدموں کے نیچے پڑیاں بکھری پڑی تھیں ۔

"نن ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ یہ میرے ہاتھ سے نہیں گریں۔"

"تو پھر ۔ کیا تمھارے باپ کے ہاتھ سے گری ہیں۔"

"دیکھیے ۔ میرے باپ تک نہ جائیے۔"

"ورنہ تم اور تمھارا باپ کیا کر لیں گے۔" دوسرا کانسٹیبل دھاڑا۔

"اُف مالک ۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" وہ رو پڑا۔

اس کے رونے دھونے کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا، پہلے تو انھوں نے اس کی خوب مرمت کی، پھر تھانے لے آئے ۔ وہاں انسپکٹر صاحب موجود تھے، انھیں جب اس کے 'جرم' کے بارے میں بتایا گیا، تو اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں، گلا پھاڑ کر بولا:

"مارو سالے کو ۔ جتنا مار سکتے ہو۔"

اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ۔ کبھی خواب میں بھی اس نے نہیں سوچا تھا کہ ایک فرضی جرم کے بدلے میں اس قدر مارا پیٹا بھی جا سکتا ہے، لیکن ابھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔ پہلے اس کا چالان کیا گیا، پولیس کے گواہ بنائے گئے ۔ چشم دید گواہ ۔ پھر اس کا

جوڈیشل ریمانڈ لیا گیا۔ اس کے بوڑھے باپ کو رات گئے
اطلاع ملی۔ سارا گھر پریشان ہو گیا۔ بوڑھا باپ اسی
وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جس سے بھی ذرا سی بھی
واقفیت تھی، اسی کے دروازے پر گیا، لیکن رات کے
بارہ بجے کسی نے اس کے لیے دروازہ نہ کھولا۔ تمام
دروازے بند تھے۔ سب لوگ گہری نیند کے مزے
لے رہے تھے۔ نیند نہیں تھی تو اس کے لیے۔ دوسرے
دن بھی کچھ نہ ہو سکا۔ اور پھر دو اڑھائی ماہ تک مقدمہ
چلنے کے بعد اسے سات سال کی سزا سنا دی گئی۔ سب
لوگ تھرا اُٹھے۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس
کے دوست اچھے نہیں تھے۔ آوارہ قسم کے تھے۔ وہ
ان کے ساتھ گھومتا تھا۔ پھرتا تھا۔ اُٹھتا تھا، بیٹھتا تھا
اور بس۔ کسی جرم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بوڑھے
باپ نے اپنا مکان بیچ کر اس کے مقدمے پر لگانے
کا فیصلہ کر لیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل جو کرنا تھی۔ اس
قدر نقدی اس کے پاس تھی نہیں۔ چنانچہ مکان فروخت
کیا گیا، کرائے کا مکان لیا گیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل
کی گئی۔ لیکن اپیل بھی خارج کر دی گئی۔ اس کی سزا
بحال رہی۔ سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کے لیے باپ کے

پاس کچھ تھا نہیں۔ رشتے داروں نے نظریں پھیر لیں۔
اور اس طرح ارشاد علی جیل سے سات سال بعد 'ارشادا'
بن کر نکلا۔

ارشادے کی دھاک تو جیل میں ہی بیٹھ چکی تھی۔ اس
سے اچھے اچھے بدمعاش ڈرنے لگے تھے، کیونکہ جیل کی
زندگی نے اسے ایک طاقت ور اور کڑیل جوان تو بنا ہی
دیا تھا۔ اس آب و ہوا نے اسے بدمعاشی کے سارے گُر
بھی سکھا دیے تھے۔

جیل سے باہر بوڑھے باپ کی جھکی کمر دیکھ کر وہ سات
سال میں پہلی بار رو پڑا اور بولا:

"تمھاری کمر ضرور سیدھی ہو گی بابا جان۔ فکر نہ کرو۔"

چند ماہ میں ہی اس نے باپ کو ایک شان دار مکان
لے دیا۔ اس کے لیے دنیا کی بے شمار نعمتیں خرید ڈالیں،
ماں تو اس کے غم میں کب کی دوسری دنیا کو سدھار
چکی تھی۔ بوڑھا باپ اس سے کچھ نہ پوچھ سکا کہ جیل سے
رہا ہونے کے چند ماہ بعد ہی اس کے پاس اتنی دولت
کہاں سے آ گئی۔ وہ پوچھتا بھی تو ارشادا اسے کوئی
جواب نہ دے پاتا۔ اب تو وہ ہیروئن کی فروخت
کا شاہ زادہ بن چکا تھا۔ ایک گروہ کا لیڈر۔ اور پھر

گروہ کے باس کے مرنے کے بعد وہ اس کی جگہ پر
باس بن گیا۔ اب وہ اس تجارت کا شہنشاہ تھا۔
پورے مُلک کا بے تاج شہنشاہ۔ اَن گنت لوگ اسے
جھک کر سلام کرتے تھے۔ ایک دن اس کے سامنے
ایک پولیس انسپکٹر کو لایا گیا۔ اس نے اسے فوراً پہچان لیا،
یہ وُہی سب اِنسپکٹر تھا۔ جس نے اسے چوک سے
پکڑا تھا۔

"اسے کیوں لائے ہو؟" اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

"بے چارہ ریٹائر ہو گیا ہے۔ باس سے اس کے
گہرے تعلقات تھے۔ دراصل یہی وہ شخص ہے۔ جو باس
کے لیے جرائم پیشہ لوگ بنایا کرتا تھا۔ اچھے بھلے شریف
لوگوں کو گرفتار کروا کر۔ ان پر ہیروئن کی فروخت کا کیس
بنا کر سزا دلوانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اور
جب گرفتار ہونے والا آدمی باہر نکلتا تو ہیروئن فروش بن
چکا ہوتا تھا۔"

"میں اس کہانی سے بخوبی واقف ہوں۔"

اس کا جملہ سُن کر سب انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا
اور اسے فوراً پہچان لیا۔

"میں وُہی ارشاد علی ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں! میں نے پہچان لیا ہے۔"

"مجھے بھی یہاں تک پہنچانے والے تم ہو۔ اس وقت
تک کتنے لوگوں کو تم نے گروہ میں شامل کیا ہو گا؟"

"تقریباً دو سو کو۔"

"اوہ! تم نے دو سو گھرانے تباہ کر دیے۔" ارشاد
نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تباہ کر دیے۔ کیا آپ اس زندگی سے خوش نہیں
ہیں؟" وہ بولا۔

"یہ زندگی مجھے تمہاری وجہ سے ملی ہے۔ جیل سے
نکل کر میں نے مُلازمت تلاش کرنے کی سوچی تھی۔
لیکن مجھے بتایا گیا کہ سزا یافتہ آدمی کو ملازمت نہیں مل
سکتی۔ وُہ اور کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ لوگ اسے طعنے
دیتے ہیں۔ لہٰذا مجھے یہ زندگی جس کا تجربہ میں نے
جیل میں حاصل کر لیا تھا، اختیار کرنا پڑی۔ ویسے بھی
مجھے اس وقت ہاتھوں ہاتھ لینے والا باس تھا۔ جو مر چکا
ہے۔ اور اسے تم پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ فلاں آدمی
اس کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ جیل میں بھی وہ ہیروئن
پہنچاتا تھا۔ اور وہاں بھی تمام کام اس کی وجہ سے ہوتا
تھا۔ لیکن اصل مجرم تو تم ہو۔ لہٰذا تم اب باقی

زندگی جیل میں گزارو گے اور یقین جان لو۔ کہ باہر نہیں نکل سکو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے لیے بس یہی سزا میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"لیکن اب خود آپ کیا کر رہے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کے گھر تباہ نہیں کر رہے؟" سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ ساکت رہ گیا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا۔ وہ کیا کر رہا ہے۔ آخر اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا:

"میں یہ سب کچھ چھوڑ دوں گا، لیکن پہلے تم جیل جاؤ گے۔ بنا دو بھئی اس پر ہیروئن کا کیس۔"

سب انسپکٹر جیل چلا گیا۔ اس کے پاس سے بھاری مقدار میں ہیروئن پکڑی گئی تھی۔ ہیروئن ایک ٹرک میں لے جا رہا تھا وہ۔ اسے عمر قید ہو گئی۔ اب ارشاد نے پوری گینگ کا اجلاس بلایا اور ان سب کے سامنے اعلان کیا:

"میں نے یہ جرائم پیشہ زندگی بالکل چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ان تمام جرائم کی سزا میں نے جرائم کرنے سے پہلے بھگت لی ہے۔ اب میں کوئی جرم نہیں

کروں گا۔ تم لوگ بھی اس زندگی کو چھوڑ دو۔ تمام ہیروئن گٹروں میں بہا دو۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں باس۔ اربوں روپے کی ہیروئن کو گٹروں میں بہا دیں۔" کئی آوازیں ابھریں۔

"ہاں! بہا دو۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں باس! یہ نہیں ہو گا۔ ہم بھوکوں نہیں مر سکتے، یہ معاشرہ ہمیں کوئی جگہ نہیں دے گا، ہم جرائم چھوڑ کر بھی جرائم پیشہ ہی رہیں گے اور بھوکوں مریں گے بھی۔"

"اگر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے تو یہ سب تم سنبھالو، میں جا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نہیں جا سکتے۔" نائب باس نے کہا۔

"کیوں۔ میں کیوں نہیں جا سکتا؟"

"اس طرح تو ریت پڑ جائے گی۔ دوستو۔ اپنے باس کو پکڑ لو۔ اور اتنا مارو، اتنا مارو کہ اس کی ہڈیاں سُرمہ بن جائیں۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ آخر میں تمہارا باس ہوں۔"

"نہیں! اب تم باس نہیں رہے۔ اب میں باس ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ مارو اسے۔ مار مار کر ختم کر دو۔"

سب لوگ مل کر اسے مارنے لگے، وہ چیختا رہا، وہ چلاتا رہا۔ لیکن اس کی کسی نے نہ سُنی۔ یہاں تک کہ اس کی آواز دبتی چلی گئی۔ کمزور ہوتی چلی گئی۔ اور پھر بالکل ختم ہو گئی۔ اس کی رُوح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اس کی لاش شہر کے ایک چوراہے سے ملی۔ یہ وہی چوراہا تھا۔ جہاں زندگی میں پہلی بار اسے گرفتار کیا گیا تھا۔ آج وہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ پولیس موقعے پر پہنچی۔ کیس درج ہوا اور فائل ہو گیا۔ اس واقعے کو دس سال گزر گئے۔ اس دوران بوڑھا باپ بھی دُوسری دُنیا کو سدھار چکا تھا۔

ٹھیک دس سال بعد۔ جب کہ ملک میں ہیروئن کا کاروبار خوب زور شور سے جاری تھا۔ ارشادے کا خُون رنگ لایا۔ لاوارث پڑا اس کا مکان حکومت سے کسی نے خرید لیا۔ وہ اس کی صفائی کروا رہا تھا کہ اسے وہاں سے ایک ڈائری ملی۔ ارشادے نے اس ڈائری میں اپنی ساری کہانی لکھی تھی۔ لفظ بہ لفظ۔ پوری کہانی۔ لیکن یہ کہانی اس رات تک تھی۔ جس رات اس نے جرائم سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد اس میں کچھ نہیں لکھا تھا۔

مکان خریدنے والا بہت ایمان دار قسم کا اور انسان دوست آدمی تھا۔ اس نے سوچا، ذرا دیکھوں تو سہی۔ اب یہ شخص کیسی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے ڈائری کو تو اپنے پاس رکھا اور پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ مکان چونکہ پولیس کے قبضے میں رہا تھا، اس لیے وہی اس کے مالک کے بارے میں بتا سکتے تھے۔ اور انھوں نے بتا بھی دیا، یہ کہ:

"اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ قاتل گرفتار نہیں ہو سکے تھے۔ یہ دس سال پہلے کا واقعہ ہے۔"

"دس سال پہلے کا!" وہ بڑبڑایا۔

اور سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا جی چاہا۔ دس سال پہلے اس شخص کو قتل کرنے والے اگر پکڑے جائیں تو کس قدر مزا آئے۔ لیکن یہ کام اس کا نہیں تھا۔ وہ کوئی پولیس انسپکٹر نہیں تھا۔ سیدھا سادا ملازم پیشہ انسان تھا، وہ سوچتا رہا، غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے ڈائری جیب میں ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ جلد ہی وہ ایک دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں۔" محمود نے تیز آواز میں کہا۔

"ہو گئے تیار ہمیں کیا۔ ہم نہیں لگاتے شرط۔ اس لیے کہ شرط لگانا حرام ہے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"حد ہو گئی۔ کم از کم یہ تو پوچھ لو۔ میں کیا شرط لگانے کے لیے تیار ہوں۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"ہم کیوں پوچھیں۔ جب کہ شرط لگانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تم دونوں میرے خلاف آج ڈٹ جانے پر ادھار تو نہیں کھائے بیٹھے۔" محمود نے آنکھیں نکالیں۔

"ہم ابھی اتنے غریب نہیں ہوئے۔ نقد کھائے بیٹھے ہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اللہ تم سے سمجھے۔"

"دعا کرو۔ وہ نہ ہی سمجھے اور اپنی رحمت سے ہمیں معاف کر دے۔"

"آمین۔" فرزانہ اور محمود نے ایک ساتھ کہا۔

"فرزانہ! تم تو کم از کم میرا ساتھ دو۔"

"تو تم۔ شرط لگائے بغیر بات کر لو نا۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"اچھا بابا یونہی سہی۔ میں ایک بات شرط لگائے بغیر کہہ سکتا ہوں۔"

"تو یہ کہنے کی بھی کیا ضرورت تھی کہ شرط لگائے بغیر۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"دھت تیرے کی۔ بال کی کھال اتارنا تو کوئی تم سے سیکھے۔" محمود بولا۔

"تو پھر پہلے تم ہی سیکھ لو۔" فاروق تڑسے بولا۔

"دیکھا فرزانہ۔" محمود اس کی طرف پلٹا۔

"نہ صرف دیکھا۔ بلکہ سنا بھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں! یہ ہوئی نا بات۔ سنو! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آج ..." وہ یہاں تک کہہ کر رک گیا۔

"یہ اب بتاتے بتاتے تمھاری گاڑی کیوں اٹکنے لگی۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا۔

"گاڑی۔ ارے میاں جاؤ۔ میرے پاس اس وقت گاڑی کہاں۔ میں تو گھر کے کمرے میں موجود ہوں۔" محمود نے ہانک

لگا دی۔

"لو فرزانہ! اب تم یہاں سو گئیں۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"شکر کرو تم عورت نہیں ہوئے۔" فرزانہ ہنسی۔

"بھائی یہ بات تو میں پہلے ہی تسلیم کرتا ہوں۔"

"کون سی بات؟" دونوں ایک ساتھ بولے۔ لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

"یہ کہ باتوں میں مَیں تم سے جیت نہیں سکتا۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

"شکریہ۔ تم نے اپنی ہار تو مانی۔ لو اب تم بتاؤ۔ بات کیا ہے۔"

"افسوس! میں نہیں بتا سکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اب تک تو بتانے پر تُلے ہوئے تھے۔ اب کہ رہے ہو کہ نہیں بتا سکتا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ بھول گیا ہوں، کیا کہنا چاہتا تھا۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"ہائیں۔ یہ تمھاری یادداشت اتنی کمزور کب سے ہو گئی۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جب سے تم نے بحث شروع کی۔"

"حیرت ہے۔ ابا جان! اب تک نہیں آئے۔" فرزانہ نے کہا۔

"بس آتے ہی ہوں گے۔ ارے یاد آ گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ آج ہمیں ایک عدد کیس ملنے والا ہے۔"

"کیا تم نجومی ہو گئے ہو؟"

"نہیں! میرا دل کہ رہا ہے کہ آج کوئی کیس مل کر رہے گا۔" محمود نے کہا۔

"اچھا بھائی اگر مل کر رہے گا تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجبور ہیں۔" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ محمود نے فوراً نعرہ لگایا:

"آ گیا کیس۔"

"کیس نہیں۔ فون آیا ہے۔ یار کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ اب کیس اور فون میں پہچان بھی ختم ہو گئی۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

محمود نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔ محمود بات کر رہا ہوں۔"

"وزیرِ داخلہ کا مشیر بات کر رہا ہوں۔ انور گردیزی۔"

"اوہ فرمائیے جناب۔"

"انسپکٹر جمشید صاحب کو فون دیں۔"

"وہ ابھی تک گھر نہیں آئے۔ آپ حکم کریں۔ میں انھیں

بتا دوں گا۔"

"کمال ہے — وہ دفتر میں بھی نہیں ہیں — اور یہاں بھی نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے بھنا کر کہا گیا۔

"تب وہ راستے میں ہوں گے جناب اور آنے ہی والے ہیں۔"

"اچھا۔ جونہی وہ آئیں — ان سے کہ دیں — مجھے فون کرلیں۔"

"او کے سر۔"

محمود نے کہا، دوسری طرف سے فون کا ریسیور رکھ دیا گیا —

محمود نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی — وہ چونک اٹھے — گھنٹی بجانے کا انداز اِنسپکٹر جمشید کا نہیں تھا —

محمود جلدی سے اٹھا اور دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھولے بغیر بولا:

"کون ہے؟"

"دروازہ کھول دو جلدی۔"

"کیوں — کیا بات ہے؟"

"باہر بہت زبردست لڑائی ہو رہی ہے — اس وقت تک

تین آدمی مارے جا چکے ہیں اور اب وہ لوگ میری طرف بڑھ رہے ہیں — اگر دروازہ نہ کھلا تو وہ مجھے بھی مار ڈالیں گے۔"

محمود نے ایک سیکنڈ کے لیے سوچا اور پھر دروازہ کھول دیا —

ایک منٹ

انسپکٹر جمشید دفتر سے اُٹھنے ہی والے تھے کہ بابا فضل کریم اندر داخل ہوا :

"سر ایک صاحب آئے ہیں۔ ملنا چاہتے ہیں۔ بہت گھبراہٹ میں ہیں، اپنا نام بھی نہیں بتا سکے۔"

"لے آئیں۔" انھوں نے پھر سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

جلد ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں لرزہ طاری تھا، رنگ بالکل فق تھا، یوں لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہو۔

"آپ کی تعریف؟"

"تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔" اس نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ آپ کا نام؟"

"نام میں کیا رکھا ہے۔"

"کیا آپ میرا وقت ضائع کرنے آئے ہیں؟"

"میں نے آج تک وقت کو کبھی آباد ہوتے نہیں دیکھا۔ جب سے دُنیا بنی ہے، یہ برباد ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔"

"یا تو آپ کا دماغ درست نہیں ہے۔ یا آپ دوسروں کا دماغ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں۔"

"تو پھر جو بات ہے۔ وہ بتا دیں۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا، ساتھ ہی انھوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ شخص ان کا ایک منٹ تو ضائع کر ہی چکا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ گھر ایک منٹ تو ضرور لیٹ پہنچتے، کیونکہ عام حالات میں وہ گاڑی مقررہ رفتار کے مطابق ہی چلاتے تھے۔

"بس آپ کا صرف ایک منٹ لینا چاہتا تھا۔ اور وہ لے چکا ہوں۔ اس جرم کی پاداش میں اگر آپ مجھے گرفتار کرنا چاہیں، گرفتار کر لیں۔" اس نے کہا۔

"گویا آپ چاہتے تھے۔ میں اپنے گھر ایک منٹ دیر سے پہنچوں۔"

"ہاں! اور اس کام کے لیے مجھے صرف اور صرف پانچ سو روپے دیے گئے ہیں۔ میں ایک پاگل قسم کا آدمی ہوں۔ بھوکوں مرتا ہوں۔ ان حالات میں اگر مجھے جیل بھی بھیج

دیا جائے تو میں اور بھی خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح
مجھے کھانے پینے کی فکر نہیں رہتی۔ لیکن اب تو اس
مہربان نے پانچ سو روپے دے ڈالے ہیں۔ کچھ دن
تو آرام سے گزر جائیں گے، شرط یہ ہے کہ آپ نے
مجھے گرفتار نہ کیا۔ گرفتار کیا تو پھر میں ان پانچ سو روپے
سے کوئی عیش نہیں کر سکوں گا۔"

"اس کا حلیہ کیا تھا۔ جو صرف ایک منٹ میرا ضائع
کرنا چاہتا تھا۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ لمبے قد کا ایک آدمی تھا۔ طوطوں جیسی لمبی ناک والا،
اس سے زیادہ تو میں بھی نہیں دیکھ سکا۔ اس نے مجھے
یہ بات سمجھائی۔ پانچ سو کا نوٹ دیا اور چلتا بنا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔ آپ نے میرا
ایک منٹ ضائع کر دیا، آپ کا بہت بہت شکریہ، لیکن
آپ نہیں جانتے۔ بعض اوقات ایک منٹ سے بہت
بڑا فرق پڑ سکتا ہے۔ بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے، لیکن
اس میں آپ کا بھی کیا قصور۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"م۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔"

وہ اس سے پہلے ہی دفتر سے باہر نکل گئے۔ اور
تیز تیز چلتے اپنی کار کی طرف آئے۔ دفتر کے تمام لوگ جا چکے
تھے۔ وہ تو یوں بھی سب سے ایک گھنٹے بعد چھٹی کرتے تھے،
اور آج تو دو منٹ مزید لیٹ ہو گئے تھے۔ اب وہ پوری
طرح چوکنے تھے۔ انھوں نے گاڑی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔
اور پھر کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب وہ
بلا کی رفتار سے کار چلا رہے تھے۔ اچانک گھر فون کرنے
کا خیال آیا۔ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملائے تو فون انگیج تھا،
ان کے نمبر پر پہلے ہی کوئی بات کر رہا تھا۔ لہٰذا انھوں
نے ریسیور رکھ دیا۔ اور سڑک پر نظریں جما دیں۔ نہ جانے
کیوں، ان کا دل دھک کر رہا تھا۔ اور پھر انھیں
رک جانا پڑا۔ آگے راستا بند تھا۔ سڑک پر کوئی حادثہ
ہو گیا تھا۔ سڑک پر ان کے پیچھے بھی لمبی لائن لگی ہوئی
تھی۔ پیچھے جانے کا راستا بھی نہیں بچا تھا۔ انھوں نے
کار سے اتر کر دیکھا۔ ٹریفک پولیس والے راستا صاف
کرنے میں بُری طرح مصروف تھے۔ وہ تیز تیز چلتے
ان تک پہنچے:

"کتنی دیر میں راستا صاف ہو گا بھئی؟" انھوں نے پرسکون
آواز میں پوچھا۔

"اوہ سر آپ — چند منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔"

"اچھا — میری کار اس طرف کھڑی ہے — نمبر تو آپ کو معلوم ہی ہے — جونہی ٹریفک کھلے — آپ اسے ایک طرف کر کے دوسروں کا راستا بنا دیجیے گا — میں رک نہیں سکتا۔"

"تب پھر آپ میری موٹر سائیکل لے جائیں۔"

"اوہ ہاں ! یہ ٹھیک رہے گا۔"

"میں کار گھر ہی لے آؤں گا۔"

"اور آپ ڈیوٹی چھوڑ کر آئیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے آنکھیں نکالیں۔

"نن — نہیں سر — جب میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت۔"

"بالکل ٹھیک۔" وہ مسکرائے — اس سے موٹر سائیکل کی چابی لی اور روانہ ہو گئے۔

لیکن فوراً ہی پیشانی پر بل پڑ گئے — ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی — انھوں نے اپنے آپ سے کہا:

"کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

انھوں نے ذہن کو دوڑایا — غور کیا، لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی — آخر وہ آندھی اور طوفان کی طرح

موٹر سائیکل چلاتے اپنے گھر تک پہنچ گئے اور اس وقت انھوں نے گھڑی دیکھی — وہ ایک دو منٹ نہیں ، پورے دس منٹ لیٹ ہو چکے تھے۔

یہ دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا — کہ دروازہ چوپٹ کھلا تھا — اور دروازے پر خون موجود تھا — اب تو ان کی سٹی گم ہو گئی — دوڑ کر اندر پہنچے — اور مزید گھبرا گئے — اندر کوئی نہیں تھا — زبردست قسم کی جنگ ہونے کے آثار ضرور تھے، ہر طرف گڑبڑ مچی ہوئی تھی — ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس گھر کے اندر زلزلہ آیا ہو — جگہ جگہ خون بھی گرا ہوا تھا —

"یا اللہ رحم۔" وہ بڑبڑائے — عین اس وقت فون کی گھنٹی نے انھیں چونکا دیا — اب انھوں نے جیب سے رومال نکالا — اور احتیاط سے ریسیور اٹھایا، کیونکہ ریسیور پر سے کسی مجرم کی انگلیوں کے نشانات مل سکتے تھے —

"ہیلو۔" وہ بولے۔

"آپ گھر آ گئے انسپکٹر جمشید۔"

وہ دوسری طرف کی آواز سن کر چونکے — آواز انور گردیزی کی تھی — وزیرِ داخلہ کے مشیر کی — وہ ان کی آواز کو اچھی طرح پہچانتے تھے —

"جی ہاں! آ ہی گیا۔"

"آپ فوراً میرے بنگلے پر آ جائیں۔"

"میں فوراً نہیں آ سکتا۔ افسوس! یہاں ایک عدد واردات ہو گئی ہے۔"

"آپ یہاں کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیں۔ میرا مسئلہ بہت اہم ہے۔"

"یہاں کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے جناب۔ میرے بیوی بچے غائب ہیں اور گھر میں خوب توڑ پھوڑ مچائی گئی ہے۔"

"ابھی ابھی تو میں نے فون کیا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے۔ اس وقت تو گھر میں خیریت تھی اور محمود نے مجھ سے بات کی تھی۔" انور گردیزی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پندرہ منٹ میں تو نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے سر۔ ان حالات میں آپ ہی فرمائیں۔ میں کیا کروں؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنا مسئلہ دیکھیں۔ میں کسی اور کو بلا لیتا ہوں۔"

"شکریہ سر! فارغ ہونے کے بعد میں فوراً آپ کی طرف توجہ دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ اب انھوں نے اکرام کو فون کیا، اسے جلدی جلدی

ہدایات دیں اور ریسیور رکھ کر گھر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، محمود، فاروق اور فرزانہ پر اچانک حملہ کیا گیا تھا۔ انھیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر۔ اس کے باوجود انھوں نے سخت مقابلہ کیا تھا، لیکن حملہ آور غالباً بہت زیادہ اور ہر طرح سے لیس تھے، ان لیے ان کی پیش نہ گئی اور وہ شکست کھا گئے، اس کے بعد انھیں اغوا کر لیا گیا۔ اب انھیں یاد آیا۔ کوئی نامعلوم آدمی چاہتا تھا کہ وہ گھر لیٹ پہنچیں۔ دفتر میں ہی انھیں ایک دو منٹ لیٹ کر دیا گیا تھا۔ پھر ٹریفک جام تھا۔ وہاں بھی دو تین منٹ ضائع ہو گئے۔ اور اس دوران ہی یہاں سب کچھ ہو گیا۔

ابھی وہ سوچ میں گم تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک اٹھے۔ اکرام اس قدر جلد نہیں آ سکتا تھا۔ نہ دستک دینے کا انداز اس کا تھا۔ وہ دروازے کی طرف آئے اور بولے:

"کون؟"

"یہ میں ہوں سر۔ ٹریفک سارجنٹ۔ آپ کی کار لے آیا ہوں۔ میری موٹر سائیکل کی چابی دے دیں۔"

"اوہ شکریہ!" انھوں نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ اپنی کار

پر ایک نظر ڈالی اور چابی اس کی طرف بڑھا دی ۔

"یہ ۔ یہ کیا ہوا سر؟" سارجنٹ نے خون کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے ۔ جب میں یہاں پہنچا تو یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا، پھر وہ جلدی سے بولا:

"میرے لائق کوئی خدمت سر؟"

"نہیں، شکریہ!"

سارجنٹ چلا گیا، اس کے بعد اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ پہنچا ۔ اس کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی:

"حیرت ہے ۔ آخر یہاں ہوا کیا ہے؟"

"زبردست کشتی ہوئی ہے اکرام، وہ بھی صرف ایک یا دو منٹ تک ۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ضرور بے خبری میں مار کھا گئے اور بیگم بھی ۔ ورنہ حالات یہ نہ ہوتے۔"

"ہوں! اور آپ نے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا؟"

"اب تم آ گئے ہو تو کوئی قدم بھی اٹھا لوں گا ۔ ادھر انور گردیزی کسی سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔"

"جی کون ۔ وزیرِ داخلہ کے مشیر؟"

"ہاں! انھوں نے بلانے کے لیے فون کیا تھا، لیکن

میں ان حالات میں کس طرح جا سکتا تھا۔" انھوں نے گھر کی چیزوں کی طرف اشارہ کیا ۔ مطلب یہ تھا کہ محمود، فاروق، فرزانہ اور ان کی والدہ کی گم شدگی کی صورت میں وہ کسی دوسری طرف کیا توجہ دے سکتے ہیں ۔

اکرام نے سر ہلا دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا، اس کے ماتحت اس کی ہدایات کے مطابق انگلیوں کے نشانات، قدموں کے نشانات اٹھانے لگے ۔ مختلف جگھوں سے خون بھی محفوظ کیا گیا ۔ انسپکٹر جمشید گھر سے باہر نکلے اور آس پاس کی جگہ کو دیکھنے لگے ۔ ایسے میں ان کے قدم خود بخود بیگم شیرازی کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے ۔ انھیں یہ سوچ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ اس قدر زبردست گڑبڑ کی آواز آخر بیگم شیرازی نے کیوں نہیں سُنی ۔ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ انھوں نے گھنٹی بجائی ۔ جلد ہی قدموں کی آہٹ سُنائی دی ۔ اور پھر بیگم شیرازی کا دروازہ کھلا ۔ ایک بوڑھی عورت کا چہرہ دکھائی دیا ۔ وہ اور بھی حیران ہو گئے ۔ کیونکہ وہ تو اکیلی رہتی تھیں ۔

"جی کیا بات ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں بڑی بی؟"

"میں بس ۔ بڑی بی ہی ہوں۔"

"آپ کا بیگم شیرازی سے کیا تعلق؟"

"دُور کی خالہ۔ غربت ماری ہوں۔ اس کے پاس چلی آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"اوہ اچھا۔ بیگم شیرازی نے بتایا نہیں۔"

"آج ہی تو آئی ہوں۔"

"وہ خود کہاں ہیں۔ انھیں بتائیں۔ انسپکٹر جمشید بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"صبح سے باہر گئی ہیں۔ اب تک لوٹ کر نہیں آئیں۔"

"کیا کہا۔ صبح سے باہر گئی ہیں۔" ان کے لہجے میں حیرت دَر آئی۔

"ہاں جی۔ ویسے کہہ کر گئی تھیں۔" بڑھیا بولی۔

"کیا کہہ کر گئی تھیں؟"

"یہ کہ میرے آنے کی وجہ سے اب انھیں اِدھر اُدھر جانے کی فرصت مل گئی ہے۔ آج وہ اپنے بچپن کی تمام سہیلیوں سے مل کر لوٹیں گی۔"

"اچھا کمال ہے۔ ان کے بچپن کی سہیلیاں اسی شہر میں رہتی ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ بات بھی نہیں بتائی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" بڑھیا بولی۔

"ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپ کو بھلا کیا پتا۔ اچھا۔ جونہی وہ آئیں۔ انھیں بتا دیجیے گا۔ میں آیا تھا۔"

"اچھی بات ہے۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے انسپکٹر رشید احمد۔"

"رشید احمد نہیں۔ جمشید احمد۔" وہ بولے اور واپس مڑ گئے۔

اندر اکرام اور اس کے ساتھی مصروف تھے۔

"اکرام! میں خطرے کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ ہمارے خلاف سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔ یہ کوئی اچانک حملہ نہیں تھا۔"

"یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"بیگم شیرازی بھی گھر میں نہیں ہیں۔"

"اس سے یہ بات کیسے ثابت ہو گئی؟"

"مطلب یہ کہ۔ گھر میں زبردست گڑبڑ ہونے کی آوازیں تو وہ سُن ہی سکتی تھیں۔ لہٰذا انھیں بھی گھر سے ہٹا دیا گیا۔ گھر میں اس وقت ایک عدد بڑھیا موجود ہے۔ اب پہلے ان کے گھر کو گھیر لو۔ پھر ہم تلاشی لیں گے۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے ماتحتوں کو ہدایات دینے لگا۔

جلد ہی انسپکٹر جمشید، اکرام کو ساتھ لے کر ایک بار پھر بیگم شیرازی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور پھر بڑھیا کی صورت نظر آئی:

"آپ پھر آگئے ۔ وہ ابھی نہیں آئیں۔"

"ہاں! ہم جانتے ہیں، وہ ابھی نہیں آئیں۔"

"تو پھر ۔ کیا بات ہے؟"

"پھر بات یہ ہے کہ ۔ آپ ایک طرف ہو جائیں ۔ ہمیں بیگم شیرازی کے گھر کی تلاشی لینا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ ایک طرف ہو جائیں۔" اکرام نے کہا۔

دونوں اندر داخل ہوئے ۔ انھوں نے سارا گھر دیکھ ڈالا ۔ اندر کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے ۔ اور بیگم شیرازی اندر کہیں بھی نہیں تھیں ۔

"بڑی بی کو بھی چیک کر لو اکرام۔"

اکرام نے بڑھیا کے چہرے کا جائزہ لیا، لیکن وہاں دور دور تک میک اپ نہیں تھا ۔

آخر وہ باہر نکل آئے ۔

"ایک آدمی بہرحال نگرانی پر لگا دو۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں بولے ۔

"جی بہتر!" اکرام نے فوراً کہا۔

اب انسپکٹر جمشید نے پھر آس پاس کا جائزہ لینا شروع

کیا اور سڑک تک آگئے ۔ یہاں آکر کوئی نشانات وغیرہ نہیں رہ گئے تھے، لیکن مجرم سڑک پر آکر تو گاڑی میں سوار نہیں ہوئے تھے ۔ گاڑی تو وہ ان کے دروازے پر ہی لے آئے ہوں گے ۔

وہ چکرا کر رہ گئے ۔ اغوا کے نشانات سڑک تک آئے تھے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں اغوا کر کے پہلے سڑک تک لایا گیا تھا ۔ پھر سڑک کے کنارے کھڑی گاڑی میں انھیں سوار کیا گیا تھا ۔ لیکن دن دہاڑے ۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس اغوا کی سڑک پر کوئی خبر نہ ہوتی ۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں نہ کر رہے ہوتے اور انھیں دیکھ کر ان کے گرد جمع نہ ہو جاتے ۔ پھر اس کا مطلب ان کی سمجھ میں آگیا ۔ الجھن پیدا کی گئی تھی ۔ نشانات سڑک تک خود بنائے گئے تھے ۔ جب کہ انھیں دروازے پر ہی گاڑی میں سوار کر لیا گیا تھا ۔

آخر انھوں نے فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات جاری کیں ۔ اب پورے شہر میں ان کی تلاش شروع ہو گئی ۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ۔ ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ ایسے میں فون کی گھنٹی بجی ۔ اکرام کے ایک ماتحت نے باہر آ کر انھیں اطلاع دی ۔ وہ اندر گئے تو

فون پر خان رحمان تھے:

"یہ میں نے کیا سنا ہے جمشید؟"

"سوال یہ ہے کہ تم نے سن کیسے لیا؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کسی نے فون کیا تھا۔ میں تو پریشانی میں اس کا نام تک نہیں پوچھ سکا۔"

"کمال ہے۔ ویسے تم نے اس آواز کی طرف تو دھیان دیا ہی ہوگا۔"

"نہیں جمشید۔ اس نے خبر ہی ایسی خوفناک سنائی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ انسپکٹر جمشید کے بیوی اور بچوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اتنا کہتے ہی ریسیور رکھ دیا تھا، اتنی سی دیر میں بھلا میں کیا غور کر لیتا۔"

"اوہ۔ ایک منٹ۔" یہ کہہ کر انھوں نے دوسرے فون سے پروفیسر داؤد کو فون کیا، لیکن ان کا فون مصروف تھا۔ انھوں نے چند سیکنڈ بعد پھر فون کیا تو سلسلہ مل گیا:

"جمشید۔ یہ تم ہو۔ میں نے سنا ہے۔"

"اوہ! تو آپ کو بھی فون کر دیا گیا ہے۔" وہ بولے۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے آپ بتائیں۔ آپ کو فون پر

کیا بتایا گیا ہے؟"

"کسی نے صرف اتنا کہا ہے۔ کہ تمھارے بیوی بچوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ایسا ہو چکا ہے۔ آپ آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں۔"

"میں اور نہیں آؤں گا۔" وہ بولے۔

"اور میں بھی آ رہا ہوں۔ جمشید۔" خان رحمان بولے۔

"اچھی بات ہے۔"

جونہی انھوں نے ریسیور رکھے۔ فون کی گھنٹی پھر بجی، اس بار آئی جی صاحب تھے:

"خیر تو ہے جمشید۔ میں نے سنا ہے..."

"اوہ! آپ کو بھی فون کر دیا گیا۔"

"ہاں! میں آ رہا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ میں نے پورے شہر کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی سر۔"

"کیوں ضرورت نہیں تھی جمشید۔ کم از کم مجرم اب انھیں شہر سے باہر تو نہیں لے جا سکیں گے۔"

"شاید ان کا ایسا کوئی پروگرام ہے بھی نہیں۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ یہ میرا خیال ہے۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"تم نے سنا اکرام ۔ کوئی نامعلوم آدمی میرے تمام دوستوں کو باری باری یہ اطلاع دے رہا ہے کہ میرے بیوی بچوں کو اغوا کر لیا گیا ہے ۔ اب ٹیلی فونوں کا سلسلہ شروع ہو گا، میرا خیال ہے، تم فون پر ایک ماتحت کو بٹھا دو ۔ جس کا فون آئے ۔ وہ ہاں میں جواب دیتا رہے۔"

"او کے سر۔" اس نے فوراً کہا اور ایک ماتحت کو فون کے پاس بٹھا دیا ۔ جلد ہی گھنٹی بجی ۔ اس نے ریسیور اٹھایا، پھر ان کی طرف دیکھا:

"اب اخبار کے دفتر سے فون ہے۔"

"بس وہی کر دو ۔ جو بتایا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"ہاں جناب ! یہ خبر درست ہے ۔ ابھی تفصیلات نہیں بتائی جا سکتیں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"بس ٹھیک ہے ۔ یہی کہتے رہو۔"

"لیکن سر ۔ اب یہ اخباری رپورٹر فوراً ادھر کا رخ کریں گے۔" اکرام بولا۔

"ایک ماتحت ان کے لیے بھی مقرر کر دو۔" وہ مسکرائے۔

جلد ہی خان رحمان اور پروفیسر داؤد پہنچ گئے ۔ انھوں

نے حیرت زدہ انداز میں تفصیلات سنیں، پھر خان رحمان بولے:

"پھر تم نے کیا اندازہ لگایا ہے جمشید؟"

"ایسا لگتا ہے جیسے مجرم چاہتے ہیں ۔ میں ان کی طرف توجہ تک نہ دے سکوں ۔ اس قدر الجھ جاؤں ۔ کہ تفتیش کر ہی نہ سکوں۔"

"اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے کہیں اور پہنچ جائیں۔" اکرام نے فوراً کہا۔

"بالکل ٹھیک اکرام ۔ میں، خان رحمان اور پروفیسر داؤد جا رہے ہیں ۔ ہم کہاں جا رہے ہیں ۔ کچھ پتا نہیں ۔ ضرورت پڑی تو میں خود فون کر لوں گا۔"

"یہ بالکل ٹھیک رہے گا سر ۔ ہم آنے والوں سے نبٹ لیں گے۔"

"بس اتنی ہی تفصیلات بتانا ۔ جتنی کہ بالکل سامنے کی ہیں۔"

"بہت بہتر!" اس نے کہا۔

تینوں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل آئے:

"لیکن جمشید ہم جائیں گے کہاں ۔ آخر ہم انھیں کہاں تلاش کریں۔"

"انھیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولے۔

"خیر — ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"بس کچھ آرام کریں گے ایک جگہ۔"

وہ اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر آ گئے — اس جگہ سے پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی واقف نہیں تھے

"کمال ہے، اس جگہ کو تو ہم بھی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں! اب ہم پریشان کرنے والوں سے محفوظ ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن بھئی — یہ ہوا کیا؟"

"انھیں اغوا کیا گیا ہے، منصوبے کے تحت — کوئی یہ چاہتا ہے — میں ان کی تلاش میں بھٹکتا رہوں اور اس کی طرف توجہ نہ دے سکوں۔"

"لیکن بھئی — آخر تم کس کی طرف توجہ دینے والے تھے؟" خان رحمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"یہ عجیب بات ہے — جب تم کسی کی طرف توجہ دینے والے تھے ہی نہیں — تو پھر اسے خطرہ محسوس ہوا؟"

"میں اس بات پر غور کر رہا ہوں — ابھی تک صرف ایک بات ذہن میں آئی ہے۔"

"اور وہ کیا؟"

"انور گردیزی صاحب نے مین اس وقت فون کیا تھا — جب میں گھر پہنچا تھا — وہ مجھے کسی سلسلے میں بلانا چاہتے تھے، لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ میرے اپنے ساتھ کیا حالات پیش آئے ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں وہاں نہ آؤں — وہ کسی اور کو بلا لیں گے — دراصل ان کا معاملہ شاید اتنا اہم نہیں تھا — ورنہ وہ مجھے بلائے بغیر نہ رہتے — ان سے بہت پرانے تعلقات ہیں — جب بھی کوئی پریشانی ہوتی ہے — فوراً مجھے بلاتے ہیں — لیکن ہو سکتا ہے — مجرم کے لیے وہ معاملہ بہت اہم ہو اور اس کی اہمیت کو انور گردیزی صاحب محسوس نہ کر سکے ہوں۔"

"ہوں! تو ان سے پوچھ لیتے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور انور گردیزی کے نمبر ملائے — فوراً ہی انور گردیزی کی آواز سنائی دی:

"انسپکٹر جمشید بات کر رہا ہوں سر۔"

"اوہ — تم — بھئی وہ — کیا بنا تمہارے بیوی بچوں کا؟" انور گردیزی نے پوچھا۔

"ابھی تک لاپتا ہیں — شہر میں تلاش کی جا رہی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اوہ اچھا۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بے دھڑک بتاؤ۔"

"نہیں سر۔ شکریہ۔ آپ والے معاملے کا کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"وہ سب ٹھیک ہو گیا۔"

"ہوا کیا تھا سر؟"

"کچھ نہیں۔ میرے دروازے پر ایک لاش پڑی پائی گئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔"

"اوہو اچھا!" ان کے منہ سے نکلا، پھر بولے: "لاش کس کی تھی؟"

"میں نہیں جانتا۔ انسپکٹر فضلی کو بھیجا گیا ہے۔ پتا نہیں، انھوں نے اب تک کیا معلوم کیا ہے۔"

"خیر! اس میں آپ کو پریشان ہونے کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں چکر لگا لوں گا۔"

"شکریہ! خواہش تو میری بھی یہی تھی، لیکن حالات ہی ایسے ہو گئے۔ خیر۔" انور گردیزی نے کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

"حیرت ہے۔ آخر کسی کو لاش ان کے دروازے پر ڈالنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"شاید کوئی انور گردیزی کو پھانسنے کے چکر میں ہے۔"

"سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم کہاں ہیں۔ پھر دیکھیں گے کہ مجھے کون سے معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ اپنے جن ماتحتوں کی تم نے ڈیوٹی لگائی ہے۔ اگر انھوں نے کوئی بات معلوم کی تو وہ اطلاع کس طرح دیں گے۔"

"ان کے پاس۔ یہاں کا فون نمبر..."

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی:

"السلام علیکم۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"سر۔ نمبر ۱۵۔"

"ہاں! کیا رپورٹ ہے؟"

"شہر میں ایک عمارت ہے۔ ایک شخص نے بتایا ہے کہ اس نے وہاں ایک گاڑی اس طرح رکتے دیکھی تھی کہ اس کا پچھلا حصہ بالکل دروازے سے جا لگا تھا۔ دن کے اوقات میں جب کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے۔ لہٰذا میں اوٹ میں ہو کر دیکھنے لگا، لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ ایک منٹ میں گاڑی وہاں سے

چلی گئی۔ اب معلوم نہیں کہ اس گاڑی سے کچھ اتارا گیا تھا
یا اس پر کچھ لادا گیا تھا۔"

"خیر۔ چیک کر لینے میں کیا حرج ہے۔ تم اس عمارت
کی تلاشی لے لو۔"

"ہم تلاشی نہیں لے سکیں گے سر۔"

"کیوں! کیا بات ہے؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ ایک چھوٹے سے ملک کا سفارت خانہ ہے۔ آپ جانتے
ہیں، سفارت خانے کی تلاشی ہم خصوصی اجازت کے بغیر نہیں
لے سکتے۔"

"اوہ اچھا۔ ہم آرہے ہیں۔ پتا بتاؤ۔"

انھوں نے پتا نوٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

"اگر انھیں اغوا کر کے کسی ملک کے سفارت خانے میں
لے جایا گیا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بڑا
ہے۔" خان رحمان بولے۔

"چھوٹے معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہی کب ہے
بھائی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اور پھر وہ اس عمارت تک پہنچ گئے۔ وہ کسی غیر مسلم
ملک کا سفارت خانہ تھا۔ ان کے ماتحت وہاں موجود تھے۔
انھیں دیکھ کر فوراً ان کی طرف آئے:

"حالات جوں کے توں ہیں۔ نہ یہاں کوئی آیا، نہ یہاں سے
کوئی گیا۔"

"بہت خوب۔" انھوں نے کہا اور آگے بڑھ کر چوکیدار کو
اپنا کارڈ دیا۔

اس نے دروازے کے سوراخ میں سے کارڈ اندر سرکایا
اور کچھ کہا۔ پتا نہیں، کس زبان میں بات کی تھی، ان تینوں
کی سمجھ میں نہ آسکی۔

اچانک دروازہ کھلا اور وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

قیدی

آنکھ کھلی تو وہ ایک کمرے میں قید تھے ۔ ان کے جسم زخموں سے چور تھے ۔ جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا ۔ تمام جسم درد کر رہا تھا ۔ سب سے پہلے محمود کی آنکھ کھلی تھی ۔ اس نے اپنی والدہ ، فاروق اور فرزانہ پر نظر ڈالی ۔ ان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی ۔ پھر باری باری سب کو ہوش آ گیا :

" یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا ؟" فرزانہ بڑبڑائی ۔

" حادثہ ۔" فاروق بولا ۔

" اگر یہ حادثہ تھا تو عجیب تھا ۔ جونہی ہم نے دروازہ کھولا ۔ بس وہ سب آندھی اور طوفان کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑے ۔ اُف ۔ کس بے دردی سے مارا پیٹا انھوں نے ہمیں ، جیسے جدی پشتی دشمن تھے ہمارے ۔ ہم تو ان کے چہرے بھی نہیں دیکھ سکے ۔"

" دیکھ بھی کیسے سکتے تھے ۔ وہ تو سب نقاب میں تھے ۔"

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا ۔ ایک چہکتی آواز سنائی دی :

" ہیلو دوستو ! اب کیا حال ہے تمھارا ؟"

انھوں نے گردنیں گھمائیں ۔ وہاں لمبے قد کا ایک شرارتی سا آدمی کھڑا تھا :

" اس ساری کارروائی کا آخر مقصد کیا ہے ؟" محمود نے پُرسکون آواز میں کہا ۔

" ہمارے باس بتائیں گے ۔ چلو ۔" اس نے خوش ہو کر کہا ۔

" کہاں چلنا ہے ؟"

" ساتھ والے کمرے میں اور کہاں ۔" اس نے کندھے اچکائے ۔

انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی ، لیکن اٹھا نہ گیا :

" کیا بات ہے ۔ خیر تو ہے ۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی ۔

" ہم سے اٹھا نہیں جا رہا ۔"

" تو پھر اتنی ہی مار اور پڑے گی ۔" اس نے کہا ۔

" کیا مطلب ؟"

" اگر تم اپنے آپ نہ اُٹھے اور مجھے اپنے ساتھیوں کو بلانا پڑا تو پھر پہلے ہم اتنی ہی مرمت کریں گے ، پھر تم لوگوں کو اُٹھائیں گے ۔"

" ہمیں ایک دو منٹ کی مہلت دو ۔ ہم اٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ کوئی بہانا نہیں بنا رہے ۔" فرزانہ نے بُرا

سامنے بنایا۔

"بہانا بنانے کے قابل ہم نے تم لوگوں کو چھوڑا ہی کب ہے۔"

"بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو دوست۔ خیر جلد معلوم ہو جائے گا۔ کتنے پانی میں ہو۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"میں پانی کا نہیں۔ ہوا کا جانور ہوں۔ لہٰذا اپنے جملے میں تبدیلی کر لو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ تم کن ہواؤں میں ہو۔"

"چلو خیر۔ اس سے گزارا ہو جائے گا۔"

وہ جیسے تیسے اٹھے۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ یہ ذرا سا فاصلہ طے کرنے میں انھیں ایک منٹ لگ گیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا۔ اندر نو آدمی موجود تھے، دسواں آدمی انھیں اپنے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ان میں سے ایک ان سب سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ لباس میں تھا، اس کی آنکھوں کے سوراخوں پر بھی جالی لگی ہوئی تھی، تاکہ کوئی آنکھوں کو بھی

نہ دیکھ سکے:

"اوہو! ہمارے معزز مہمان آ گئے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"شکریہ!" فاروق نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"ارے! ان میں تو طنز کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ تم تو کہ رہے تھے۔ عقل سے بالکل پیدل ہیں۔" باس نے حیران ہو کر کہا۔

"تو باس۔ عقل سے سوار ہونے میں کیا دیر لگتی ہے، حد درجے زخمی ہیں بے چارے۔ سوار ہو گئے ہوں گے۔" ایک نے کہا۔

"تمھارا جواب پسند آیا۔ میں تمھیں پسندے کھلاؤں گا۔"

"جی باس! کیا فرمایا۔ پسندے کھلائیں گے۔ یہ کیا ہوتے ہیں؟"

"تمھیں اتنا نہیں معلوم۔ پسندے کیا ہوتے ہیں۔" باس نے جھلّا کر کہا۔

"ج۔ جی نہیں باس۔ کبھی کھائے ہی نہیں تو معلوم کیسے ہو گا۔"

"اب تو پسندے ضرور کھلاؤں گا۔ اور اگر کہو تو ان کے گوشت کے کھلا دوں۔" باس بولا۔

"ارے باپ رے — میں آدم خور نہیں ہوں باس — ویسے
آپ کے جملے سے اتنی بات سمجھ میں آ گئی کہ پسندے گوشت
کے بنتے ہیں۔"

"ہاں بالکل — خیر چھوڑو پسندوں کو — اب ذرا ان سے
دو دو باتیں کر لیں — ہاں بھئی — یہ پڑا ہے فون — چاہو
تو اپنے والد صاحب کو فون کر سکتے ہو۔"

"کیا واقعی۔" محمود نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہائیں تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں — میرے نمک خوارو
کیا تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے سُنا ہے؟"

"جی — جی نہیں تو — کبھی بھی نہیں — بلکہ ہرگز نہیں۔"
کئی آوازیں اُبھریں۔

"شکریہ — تم نے سن لیا — میں جھوٹ نہیں بولتا — کرو
فون۔" باس بولا۔

محمود نے آگے بڑھ کر گھر کے نمبر ڈائل کیے — دُوسری
طرف سے فوراً ریسیور اٹھایا گیا:

"ہیلو کون؟"

"میں محمود بول رہا ہوں۔" محمود نے دوسری طرف سے
ایک اجنبی سی آواز سُن کر کہا۔

"اوہ! یہ آپ ہیں — آپ کہاں ہیں؟" اس نے چونک

کر کہا۔

محمود سمجھ گیا — وُہ کوئی سادہ لباس والا تھا — ان کے
والد ضرور ان کی تلاش میں نکلے ہوئے ہوں گے — اس کی
ڈیوٹی وہاں لگائی گئی ہوگی۔

"ہم نہیں جانتے — ہمیں مکمل بے ہوشی کی حالت میں
یہاں لایا گیا ہے — ایک منٹ ٹھہریں۔" یہ کہ کر اس نے باس
کی طرف دیکھا اور بولا:

"ہاں جناب — کیا کہنا ہے ان سے؟"

"کیا انسپکٹر جمشید خود بات کر رہے ہیں؟"

"نہیں — ان کا ایک ماتحت۔"

"ہوں ٹھیک ہے — اس سے کہ دو — وُہ انسپکٹر جمشید کو
اطلاع دے دے — ان کے بیوی بچے شہر کی ایک عمارت
میں قید ہیں — تلاش کر سکتے ہیں تو کر لیں — صرف چوبیس گھنٹے
کی مہلت دی جاتی ہے — چوبیس گھنٹے کے بعد ان چاروں کی
لاشیں شہر کی کسی سڑک پر سے مل جائیں گی۔"

محمود نے یہ پیغام دہرا دیا۔

"بس — ریسیور رکھ دو — تمہارا کام ختم ہو گیا۔"

"اس پیغام کی ضرورت نہیں تھی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیوں ضرورت نہیں تھی؟"

"اس لیے کہ وہ پہلے ہی ہماری تلاش میں ہیں۔ اور ایک ایک منٹ ان پر بھاری گزر رہا ہے۔"

"یہی ہم چاہتے ہیں۔ کہ ان پر ایک ایک منٹ قیامت بن کر گزرے۔" ایک نے کہا۔

"آخر آپ لوگوں کو ان سے اور ہم سے کیا دشمنی ہے؟"

"بہت پرانی۔ اتنی کہ تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کیا آپ کوئی بین الاقوامی جاسوس ہیں۔ جیسے جیرال۔ جی سوف، سی مون وغیرہ۔"

"ارے نہیں۔ میں تو اسی ملک میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی ملک میں رہوں گا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تب پھر دشمنی اس قدر پرانی کس طرح ہو گئی۔ کیا آپ کو اس سے پہلے کبھی انتقام لینے کا موقع نہیں ملا؟"

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کام کا وقت ہی اب آیا ہے۔"

"ہمارے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"بس اتنا ہی کام ہے۔ کہ تمہارا پیغام ان تک پہنچا دیا جائے۔ تم لوگ یہ کہو۔ کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ شرلو۔ انھیں اسی کمرے میں بند کر دو۔ اور دھیان رکھنا۔ یہ بہت خطرناک ہیں۔"

"اب نہیں رہے باس۔ اب تو ان بے چاروں کی ساری خطرناکی نکل چکی ہے۔" شرلو نے ہنس کر کہا۔

"تم انھیں نہیں جانتے۔" باس نے سرد آواز میں کہا۔

"بہت بہتر باس! میں ان کا خوب دھیان رکھوں گا۔"

"اگر یہ نکل گئے تو ان کی جگہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

"لگ۔ کیوں باس۔ کیا ہمارے ہاں صابن ختم ہو گیا ہے؟"

"زیادہ مذاق نہیں۔ مذاق ہی کرنا ہے تو جا کر ان کے ساتھ مغز مارو۔" باس نے جھلا کر کہا۔

"ان سے تو خیر۔ اب مارنا ہی ہے۔ بے کار بیٹھ کر کیا کروں گا۔"

وہ انھیں پھر اسی کمرے میں لے آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور خود ایک سٹول پر بیٹھ گیا:

"اب ہم آپس میں بات چیت کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔ یہ آپ کا باس کرتا کیا ہے؟"

"کوئی ایک کام کرتا ہے۔ ہزاروں دھندے کرتا ہے۔ اس وقت منشیات کا بادشاہ ہے یہ۔ بے تاج بادشاہ کہ لو۔ پورے ملک میں منشیات کا کاروبار اس کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ اور کوئی آج سے نہیں۔ ایک مدت سے۔"

"اور۔ اور کیا کام کرتا ہے؟"

"ان گنت جوئے خانے اس کے چل رہے ہیں۔ شراب کا کاروبار بھی ہے۔"

"مطلب یہ کہ تمام بُرے کاموں کا اس نے ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ہائیں۔ تم ان کاموں کو بُرے کام کہہ رہے ہو۔ ارے بھئی۔ یہ تو آج کے دَور کے نہایت اچھے کام ہیں۔ کبھی ہیروئن پی ہے؟"

"اللہ محفوظ ہی رکھے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ آج چکھ کر دیکھ لو۔"

"توبہ کرو جی۔"

"پلا کر رہوں گا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔" محمود چلایا۔

"ارے ارے۔ کیا ہو گیا ہے۔ ایک دم کیوں اس قدر گرم ہو گئے ہو۔ ابھی تو ہم ویسے ہی زخموں سے چور ہیں دیکھا جائے گا۔" فاروق گھبرا گیا۔

"کیا دیکھا جائے گا۔ تم لوگ صرف چوبیس گھنٹے کے مہمان ہو۔"

"تو کیا چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں؟" فرزاد نے آنکھیں نکالیں۔

"ان کے گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"پورے چوبیس گھنٹے لگتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"اے۔ مجھے باتوں میں نہ لگاؤ۔ ہیروئن پینا پڑے گی۔ آج زندگی میں پہلی اور آخری بار۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"دیکھو بھائی۔ ہماری تم سے درخواست ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ ہمیں مجبور نہ کرو۔ ہر نشہ لانے والی چیز ہمارے لیے حرام ہے۔ اس لیے کہ ہمارا دین یہی کہتا ہے۔"

"تب پھر آج تم یہ حرام چیز ضرور پیو گے۔"

"آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ اچھے بھلے بیٹھے تھے کہ ہتھے اکھڑ گئے۔" محمود نے نرم آواز میں کہا۔

"میں ذرا سر پھرا واقع ہوا ہوں۔"

"ذرا تو خیر نہیں۔ اچھے بھلے سر پھرے ہیں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں اچھا بھلا سر پھرا ہوں۔ لہٰذا تمھیں ہیروئن پینا پڑے گی۔"

"تو کیا تم بھی پیتے ہو؟"

"اس گینگ کے لوگوں کے لیے ہیروئن بالکل حرام ہے، باس کا حکم ہے۔ جس کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی کہ اس نے ہیروئن پی ہے۔ تو اس کی کھال گِرا دی جائے

گی اور ایک ساتھی کی کھال واقعی گرا دی۔"

"ارے ۔ وہ کب ۔ اور کیسے؟" محمود کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی ۔

"بس ۔ پی لی ۔ اس نے ہیروئن ۔ باس کو پتا چل گیا ۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ باس کو کس طرح پتا چلا ۔ بہرحال ۔ اس نے اسے الٹا لٹکوا دیا ۔ اور بھیڑ بکریوں کی طرح اس کی کھال اتروائی گئی۔"

"کیا مطلب ۔ کیا زندہ انسان کی؟" فارُوق چلّایا۔

"ارے ۔ نہیں ۔ باس اس حد تک بھی درندہ نہیں ۔ پہلے اس کے گلے پر چھری چلائی گئی ۔ پھر جب وہ بے چارہ مر گیا تو اس وقت اسے الٹا لٹکایا گیا۔"

"اوہ ۔ تو یہ بات ہے ۔ پھر آپ ہمیں کیوں پلانا چاہتے ہیں ۔ جب کہ آپ لوگوں کو اجازت نہیں۔"

"ہمیں اجازت نہیں ہے نا ۔ تم لوگ تو آزاد ہو۔"

"آزاد کہاں ۔ قید ہیں ہم تو۔"

"میرا مطلب ہے ۔ ہیروئن پینے کے سلسلے میں ۔ باس کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا ۔ بلکہ وہ تو اب تم لوگوں کو چوبیس گھنٹے سے پہلے پوچھے گا بھی نہیں۔"

"یہ اس کی بہت مہربانی ہے ۔ کہ وہ اب ہمیں پوچھے

گا ہی نہیں۔"

"اس لیے کہ اس کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔" اس نے کہا ۔

"ہاں! وہ تو ظاہر ہے ۔ جب تاج والے بادشاہ کی بے پناہ مصروفیات ہوتی ہیں تو بے تاج بادشاہ کی مصروفیات اس سے کہیں زیادہ ہوں گی۔" فرزانہ نے سر ہلایا۔

"اچھا ایک بات بتائیں۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"پوچھو۔" اس نے مزے میں آ کر کہا۔

"آپ اس گینگ میں کس طرح آئے؟"

"یہ ایک عجیب کہانی ہے ۔ ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ پولیس والوں نے پکڑ لیا ۔ پکڑ کر تھانے لے گئے ۔ اور مجھ پر ہیروئن کا کیس بنا دیا ۔ عدالت نے سات سال قید کی سزا سنائی ۔ باہر نکلا تو باس کے آدمیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سمجھایا کہ اب معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا ۔ لہٰذا باس کے گینگ میں شامل ہو جاؤ ۔ میں نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ مجھ پر جھوٹا کیس بنایا گیا تھا ۔ لیکن انھوں نے میری کوئی بات نہیں سُنی ۔ بلکہ دھمکی بھی دی کہ اگر گینگ میں شامل نہ ہوا تو میرے بارے میں شہر کی دیواروں پر ساری کہانی لکھی نظر آئے گی ۔ اور کہیں کوئی ملازمت

نہیں مل سکے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ گینگ میں شامل ہو
گیا۔ اب تو میں باس کا بہت پسندیدہ آدمی بن گیا ہوں
اور پسندیدہ سے مجھے پسندے پھر یاد آ گئے۔ تم لوگوں نے
کھائے ہیں کبھی پسندے"؟

"ہاں! بہت مرتبہ۔ اگر تم پسند کرو۔ تو آج ہی کھلا سکتے
ہیں"۔ بیگم جمشید پہلی مرتبہ بولیں۔

"آج ہی۔ وہ کیسے۔ کیا آپ یہاں پسندے تیار کریں
گی"۔ وہ حیران ہو کر بولا۔

"اگر اس عمارت میں کوئی باورچی خانہ ہے تو ہمیں
وہاں لے چلیں اور صرف گوشت لا دیں۔ جیسا گوشت میں
کہوں"۔ وہ بولیں۔

"بہت خوب! میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔ باس
تو جا چکا ہے۔ اب چوبیس گھنٹے بعد ہی آئے گا۔
یہاں میرے چند ساتھی اور ہیں۔ میں ان سے مشورہ
کر لوں"۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بولے۔

وہ باہر نکل گیا اور جاتے وقت دروازہ باہر سے
بند کر گیا۔

انھوں نے اپنا جائزہ لیا۔ جسم اب کسی قدر حرکت

کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ لہٰذا وہ فوری طور پر عمل کرنے
کے لیے تیار ہو گئے۔ منہ سے آواز نکالے بغیر انھوں نے
اپنا پروگرام ترتیب دیا اور پھر انتظار کرنے لگے۔
جلد ہی انھوں نے دروازہ کھولے جانے کی آواز سُنی۔

اس کا دوست

عمارت کے دروازے پر نمودار ہونے والا شخص ایک نامی گرامی غنڈہ تھا۔ اس غنڈے کو انسپکٹر جمشید اپنے ہاتھوں کئی بار سزا دلوا چکے تھے۔ یہاں تک کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی اس سے واقف تھے۔ شہر میں غنڈہ گردی اور اغوا کی وارداتوں میں اکثر اس کا ہاتھ ہوتا تھا۔

"جری۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔"

"اوہو اچھا۔ اب میں پوچھ بھی نہیں سکتا۔"

"نہیں! اس لیے کہ میں نے اس سفارت خانے میں ملازمت کر لی ہے۔ آپ سفیر صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ انھیں اطلاع دو۔ ہم آئے ہیں۔"

"وہ اس وقت نہیں ہیں۔ آج یہاں سفارت کاروں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ سب لوگ کل آئیں گے۔"

"کیوں! کیا وہ چھٹی پر ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں! چھٹی پر ہیں۔"

"بہت خوب۔ آئیے بھئی۔ اندر چلیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب۔ اندر چلیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

"کیوں۔ بات ہونے میں کیا ہے۔"

"آپ اندر نہیں جا سکتے۔"

"آخر کیوں؟"

"یہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ ہے۔ سفیر صاحب کی اجازت کے بغیر آپ اندر نہیں جا سکتے۔"

"اچھا تو پھر سنو۔ میں یہاں کی تلاشی لینے آیا ہوں۔"

"کیا کہا۔ تلاشی۔" وہ چونکا۔

"ہاں! تلاشی۔ کوئی اعتراض۔"

"ایک دو اعتراض۔ یہاں تو اعتراضات کی لائن لگی ہے۔"

"میں اس لائن کو توڑ دوں گا۔"

"آپ سفیر صاحب کی اجازت کے بغیر تلاشی نہیں لے سکیں گے۔ پہلے آپ اپنی حکومت سے بات کریں، آپ کی حکومت سفیر کو اطلاع دے گی۔ کہ آپ کو تلاشی لینے دی جائے۔ اس کے بعد اگر سفیر کے ملک کو اس بات پر اعتراض ہوا تو دونوں ملکوں کے حالات خراب ہو جائیں گے۔"

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا، میں تو صرف ایک بات کو جانتا ہوں۔" انھوں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"آپ جس بات کو جانتے ہیں، وہ کیا ہے؟" جری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ بات یہ ہے کہ مجھے یہاں کی تلاشی لینی ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔ کیا سمجھے؟"

"اس طرح تو جناب آپ کی بڑے پیمانے پر جواب طلبی ہو جائے گی۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ ہوتی رہے جواب طلبی۔"

"آپ کی مرضی۔ میں سفیر صاحب کو اطلاع دے رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف مڑ گیا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" وہ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ جری سیدھا فون کی طرف گیا۔ انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ انسپکٹر جمشید نے خان رحمان سے کہا۔

"اندر سے دروازہ بند کر دو خان رحمان۔"

"بہت بہتر۔" انھوں نے مسکرا کر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہیلو سر۔ میں جری بات کر رہا ہوں۔ جی۔ جی نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔ یہاں انسپکٹر جمشید اور ان کے دو ساتھی موجود ہیں، زبردستی سفارت خانے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ آخر ریسیور رکھ کر ان کی طرف مڑا:

"اب آئے گا مزا۔"

"کیسا مزا؟" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"سفیر صاحب۔ تشریف لا رہے ہیں۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بھی خوش ہو کر کہا۔

"پروفیسر صاحب۔ آئیے۔ ہم اپنا کام شروع کریں۔"

"آپ کو پتا ہے۔ سفیر صاحب نے مجھے کیا حکم دیا ہے؟"

"کیا۔ دیا ہے؟" انھوں نے سرسری انداز میں کہا۔

"یہ کہ میں آپ کو اپنے پستول کی زد میں لے لوں۔ اور اس وقت تک لیے رہوں۔ جب تک کہ وہ یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

"تو پھر۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ دیکھیے۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔" وہ کہہ کر پرے ہاتھ آگے لے آیا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی پستول تھا۔

"لو، ہم اپنا کام شروع کر رہے ہیں۔ تم فائر کر دو۔" یہ کہہ کر وہ مڑ گئے۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ گولی چلا دوں گا۔"

"ارے بھئی تو اب چلا بھی دو۔ انتظار کس بات کا ہے، ہم تلاشی شروع کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید چہکے۔

انھوں نے تلاشی شروع کر دی، لیکن جری فائر نہ کر سکا۔

"کیوں بھئی۔ تم نے فائر نہیں کیا۔"

"آپ لوگ بہت چالاک ہیں۔ شاید آپ سمجھ گئے کہ سفیر صاحب آپ کے قتل کا حکم مجھے نہیں دے سکتے۔"

"جری صاحب۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کوئی سفیر قتل کا حکم کس طرح دے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ تلاشی لے لیں۔ وہ آئیں گے تو صورتِ حال بتا دوں گا۔"

"اس نے کیا کہا ہے؟"

"یہ کہ میں آپ لوگوں کو پستول کی زد پر لے لوں۔ اور وہ میں نے لے لیا۔ لیکن آپ اس زد کو نہ مانیں تو میں کیا کروں۔"

"بالکل ٹھیک۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

تھوڑی دیر بعد وہ پوری عمارت کی تلاشی لے چکے تھے اور انھیں سخت مایوسی ہوئی تھی، کیونکہ وہاں محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔"

"کوئی بات نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے۔ آئیے چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"کیا آپ سفیر صاحب کے آنے تک نہیں ٹھہریں گے؟"

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت باہر ایک سفید رنگ کی کار آ کر رکی۔ اس میں سے ایک لمبے قد کا آدمی باہر نکلا۔

"کیا آپ لوگ جا رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں! اس لیے کہ ہم تلاشی لے چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا کہا۔ آپ تلاشی لے چکے ہیں؟"

"ہاں بالکل۔ اور کیا کرتے۔ تلاشی ہی تو لینے آئے تھے۔"

"میں نے تم سے کیا کہا تھا جری۔" آنے والے نے کہا۔

"یہ رعب میں نہیں آئے سر، میں نے تو ان پر پستول تان لیا تھا۔"

"اوہ اچھا۔ خیر۔ میں وزیرِاعظم سے بات کروں گا اور ان کے اس غیر قانونی اقدام کی انھیں سزا مل کر رہے گی۔"

"لیکن شرط یہ ہے کہ اقدام غیر قانونی ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ کے خیال میں یہ اقدام غیر قانونی

نہیں تھا۔"

"نہیں۔ اس لیے کہ مجھے اس کا اختیار ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے صدر صاحب کا خصوصی اجازت نامہ نکال کر دکھا دیا۔ اس نے جلدی جلدی اس کو پڑھا اور پھر منہ بنا کر بولا:

"یہ کیسا قانون ہے؟"

"بس! ہمارے ملک کا قانون ایسا ہی ہے۔ اگر پسند نہیں تو آپ یہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیں۔" وہ بولے۔

"غور کروں گا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

وہ وہاں سے نکل کر اس سادہ لباس والے کی طرف آئے جس نے اطلاع دی تھی:

"وہ آدمی کہاں ہے۔ جس نے تمھیں اطلاع دی تھی۔" ان کے لہجے میں کوئی ناخوش گواری نہیں تھی۔

"میں نے اس کا نام اور پتا نوٹ کر لیا تھا سر۔ روکنے کی تو ضرورت نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ نام اور پتا مجھے دے دو۔ اور تم بدستور اس سفارت خانے کی نگرانی کرتے رہو۔ بلکہ ایک دو اور ساتھیوں کو بلا لو۔ اگر سفیر کہیں جائے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔ جرمی کہیں جائے تو اس کا بھی تعاقب کیا جائے۔"

"جی۔ جرمی۔ کیا مطلب؟"

انھوں نے جرمی کے بارے میں بتایا اور اس پتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ پتا تلاش کرنے میں انھیں قدرے دقت ہوئی، کیونکہ وہ ایک غریب آدمی کا پتا تھا۔ اس نے انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تم نے محکمہ سراغ رسانی کے ایک شخص کو اطلاع دی تھی کہ سفارت خانے کی عمارت کے دروازے پر ایک گاڑی اس طرح کھڑی کی گئی تھی جیسے چوری چھپے اس پر کوئی چیز لادی گئی ہو یا اتاری گئی ہو۔"

"ہاں جناب! کیا آپ کا تعلق بھی محکمہ سراغ رسانی سے ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں بالکل۔" انھوں نے کہا، پھر بولے:

"یہ اطلاع دینے کے لیے آپ نے کتنا معاوضہ وصول کیا تھا؟"

"جی۔ کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا آپ کو کسی نے کچھ رقم دے کر یہ اطلاع دینے کے لیے نہیں کہا تھا؟"

"نن۔ نہیں جناب۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے کانپ کر کہا۔

"تو پھر سچ بتا دیں۔ بات کیا ہے؟"

"میں نے واقعی ایک ایسی گاڑی کو دیکھا تھا۔"

انسپکٹر جمشید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں سچائی کی جھلک تھی۔ آخر انھوں نے کہا:

"اچھی بات ہے۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔"

وہ اٹھ آئے۔

"یہ شخص جھوٹا نہیں ہے۔ نہ لالچ میں آ کر یہ بیان دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہاں کوئی گاڑی اس طرح کھڑی کی گئی تھی، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس پر سے کوئی چیز اتاری گئی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے، اس پر کوئی چیز لادی گئی ہو۔ لیکن اندر محمود، فاروق، فرزانہ اور ان کی والدہ کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملے۔ وہ جہاں قید کیے جاتے ہیں، وہاں اپنے آثار ضرور چھوڑتے ہیں۔"

"ہوں! ہمارا اس وقت مسئلہ محمود، فاروق، فرزانہ اور..."

اس وقت گاڑی میں لگے فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو سر۔" دوسری طرف سے ایک ماتحت کی آواز سنائی دی۔

"ہاں! کیا بات ہے؟"

"گھر کے نمبروں پر محمود صاحب کا فون آیا تھا۔ انھوں

نے کہا ہے۔ وہ شہر کی ایک عمارت میں قید ہیں۔ انھیں چوبیس گھنٹے بعد ہلاک کر دیا جائے گا۔"

"کیا!!!" وہ چلائے۔

"جی ہاں! مطلب یہ کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے پہلے ہمیں انھیں تلاش کرنا ہو گا۔"

"ہوں! اچھا ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا، فون پر ہونے والی بات بتانے کے بعد وہ بولے:

"آپ دونوں نے کچھ اندازہ لگایا؟"

"کس بارے میں؟"

"وہ نامعلوم شخص ہمیں اب چوبیس گھنٹے تک مزید الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے، ہم کسی اور طرف توجہ نہ دیں۔"

"آخر وہ ہمیں کس معاملے کی طرف سے دور رکھنا چاہتا ہے؟"

"یہی سوچ سوچ کر میں تھک چکا ہوں۔ اور رہ رہ کر مجھے ایک ہی خیال آتا ہے۔"

"اور وہ کیا؟" خان رحمان فوراً بولے۔

"وہ لاش۔ جو انور گردیزی کے دروازے پر ملی ہے۔ مجھے اس کی تفتیش سے روکنے کی سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ انور گردیزی صاحب نے مجھے بلانے کے لیے فون کیا،

کیونکہ وہ صرف اور صرف مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ محکمہ سراغ رسانی میں اگر کوئی کام ہوتا ہے تو فوراً مجھ سے کہتے ہیں۔ لہٰذا آج بھی انھوں نے فوراً گھر فون کیا، لیکن میں گھر نہیں پہنچا تھا، اس لیے کہ دفتر میں ایک صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے تھے۔ وہ کسی کے کہنے پر میرا صرف ایک منٹ ضائع کرنا چاہتے تھے۔ اس ایک منٹ کے ضائع ہونے کی وجہ سے اور پھر راستے میں کسی ٹریفک حادثے کی وجہ سے میں لیٹ ہو گیا۔ ادھر گھر میں محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم کے اغوا کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب میں گھر پہنچا تو گھر صاف تھا۔ اور اب محمود سے فون کرایا گیا ہے کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انھیں تلاش کر لوں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ مجرموں کو یہ مہلت دینے کی آخر کیا ضرورت اور یہ بتانے کی کیا ضرورت؟ صاف ظاہر ہے۔ وہ چاہتے ہیں۔ میں صرف اور صرف ان کی طرف توجہ دیتا رہوں۔ لہٰذا اس کیس کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میں اس لاش پر کام شروع کر دوں، جو انور گردیزی صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر ملی ہے۔"

"بات تو تمھاری دل کو لگتی ہے جمشید، لیکن اگر تمھارا اندازہ غلط ہوا اور اس طرح چوبیس گھنٹے گزر گئے تو..." پروفیسر داؤد

نے گھبرا کر کہا۔

"تو کیا ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ دوسرے یہ کہ اکرام اور اس کے ماتحت شہر میں تلاش کا کام اب تیز تر کر دیں گے۔ میں اسے ہدایات دے دیتا ہوں۔ خاص طور پر وہ اس سفارت خانے کو بھی نظر میں رکھیں گے۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

انھوں نے پہلے اِدھر اُدھر فون کیے۔ اکرام اور اس کے تمام ماتحتوں کو ہدایات دیں۔ اس طرح پورے شہر میں تلاش کا جال پھیلا کر وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کے ماتحت کوئی کام چور تو تھے نہیں کہ ان کی نگرانی کی ضرورت ہوتی، انھیں تو بس ایک حکم دے دیا جاتا تھا اور وہ مشین کی طرح حرکت میں آ جاتے تھے۔ اور جسم کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی کام میں لاتے تھے۔

اب انھوں نے انور گردیزی کا رخ کیا۔ پورے ملک میں انسپکٹر جمشید کو بھی انور گردیزی بہت پسند تھے۔ لوگوں کی بھلائی کے ان گنت کام کرتے رہتے تھے۔ وہ جب کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو پولیس کے کچھ اہل کار وہاں پہرہ دیتے نظر آئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔

"اس وقت تک کیا کارروائی ہو چکی ہے؟"

"لاش کی تصاویر لی جا چکی ہیں۔ آس پاس سے قدموں اور انگلیوں کے نشانات اٹھائے جا چکے ہیں سر۔ اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا جا چکا ہے۔"

"لاش کی جامہ تلاشی لی گئی؟"

"ہاں جناب! اس کی تلاشی پر کوئی چیز نہیں مل سکی۔"

"کیا مطلب۔ کیا کسی بھی قسم کی کوئی چیز نہیں ملی۔ میرا مطلب ہے۔ ذاتی ضرورت کی کوئی چیز بھی نہیں۔ جیسے کوئی نقدی۔ سگریٹ۔ سگریٹ لائٹر۔ یا کوئی چابیوں کا چھلا۔ رومال۔ کوئی قلم۔ کاغذ وغیرہ یا کوئی شناختی کارڈ۔"

"جی ہاں! کچھ بھی نہیں ملا۔" اس نے کہا۔

"انسپکٹر فضلی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ جا چکے ہیں۔ اپنا کام مکمل کر کے۔"

"اوہ اچھا۔"

انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ انور گردیزی صاحب کے ملازم نے دروازہ کھولا، وہ انھیں اچھی طرح پہچانتا تھا

"آئیے جناب۔" وہ انھیں اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔

ایک منٹ بعد ہی انور گردیزی کمرے میں داخل ہوئے۔

"اوہو۔ آپ صاحبان بھی ہیں۔" انھوں نے خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف دیکھ کر کہا اور تیزی سے ان کی طرف آئے۔ السلام علیکم کہنے اور ہاتھ ملانے کے بعد وہ بیٹھتے ہوئے بولے:

"اس کا مطلب ہے۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور بھابی صاحبہ مل گئے ہیں۔"

"جی! یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟" انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔

"آپ لوگوں کی یہاں آمد کی وجہ سے۔"

"نہیں سر۔ وہ ابھی نہیں ملے۔ بلکہ اغوا کرنے والوں کی طرف سے دھمکی ملی ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تلاش کر لیں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

"ارے باپ رے۔" وہ گھبرا گئے، پھر جلدی سے بولے:

"اور آپ ادھر آ گئے۔ آپ کو تو اب ایک ایک منٹ ان کی تلاش میں صرف کرنا چاہیے۔"

"یہی مجرم چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! یہی مجرم چاہتا ہے سر۔" یہ کہہ کر انھوں نے تفصیلات سنا دیں۔

"اوہ۔ تو پھر۔ تم نے کیا اندازہ لگایا جمشید؟"

"شہر میں اس وقت صرف ایک واردات آپ کے دروازے پر ہوئی ہے اور آپ صرف اور صرف مجھے بلانا پسند کرتے ہیں۔ شاید مجرم کو بھی یہ بات معلوم تھی، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس واردات کی تفتیش کروں، لہٰذا اس نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ جب میں اس نتیجے پر پہنچا تو میں بھی ادھر آ گیا۔ کہ کیوں نہ یہاں سے ہی تفتیش کا آغاز کیا جائے۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے، لیکن پھر چوبیس گھنٹوں کا کیا بنے گا؟"

"اکرام اور اس کے ماتحت اور کچھ دوسرے لوگ شہر میں انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ جلد سراغ مل جائے گا ان شاء اللہ۔"

"میں تو یہی کہوں گا کہ تم ان کی طرف ہی توجہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ چوبیس گھنٹے گزر جائیں اور..." وہ آگے کچھ نہ کہ سکے اور پریشان ہو گئے۔

"فکر نہ کریں سر۔ موت اور زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔" وہ بولے۔

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اب آپ ہمیں یہاں ہونے والی واردات کی تفصیلات بتا دیں۔"

"یہ واردات میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔ انسپکٹر فضلی بھی ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکے۔ آج دو بجے کے قریب میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ابھی دفتر سے لوٹا ہی تھا۔ ملازم باہر گیا۔ اس نے بتایا کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ملازم سے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ ابھی ملازم باہر پہنچا نہیں تھا کہ باہر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم گھبرا گئے اور باہر کی طرف دوڑے۔

باہر نکل کر دیکھا تو وہ شخص جو ملاقات کرنے آیا تھا۔ اپنے ہی خون میں تڑپ رہا تھا۔ اور حملہ آور کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا۔ مقتول میرا دور کا رشتے دار تھا۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ مقتول آپ کا دور کا رشتے دار تھا؟"

"ہاں! کسی کام سے آیا ہو گا بے چارہ۔" وہ بولے۔

"ان کا نام کیا تھا جناب؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اس کا نام راحیل گردیزی تھا۔ یوں سمجھ لیں، چچا زاد بھائی تھا۔ لیکن سگا نہیں، کافی دور کا۔ یہ رشتے داریوں کے پیچ میری سمجھ سے باہر ہیں۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ وہ آپ کے دور کے رشتے دار تھے۔"

"ہاں بالکل۔"

"میں نے سُنا ہے۔ ان کی جامہ تلاشی پر کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔"

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔"

"کیا وُہ کوئی غریب آدمی تھے؟"

"نہیں۔ انھوں نے تو ابھی ابھی سرکاری نیلامی میں ایک مکان خریدا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں نے ہی ان کی مدد کی تھی۔"

"آپ نے مدد کی تھی۔ میں سمجھا نہیں۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

"وُہ اس مکان کو خریدنے کے خواہش مند تھے۔ وُہ مکان لاوارث تھا۔ اور میرے ذمّے لگا ہوا تھا۔ سرکاری چیز نیلامی کے بغیر فروخت نہیں کی جا سکتی۔ تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ملے۔ وہ مجھ سے ملے اور اس مکان کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے بتا دیا کہ وُہ تو صرف نیلامی کے ذریعے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ نیلامی میں حصّہ لیں گے۔ ان کے پاس پیسے ہیں۔ میں نے نیلامی کا دن مقرر کر دیا۔"

"لیکن آپ نے ان کی مدد کس طرح کی؟"

"بولی دینے والے سے کہ دیا تھا کہ بولی راحیل گردیزی کے

نام پر ہی ختم کر دئے۔ اور راحیل سے بھی کہ دیا تھا کہ بولی دینے میں پیچھے نہ رہے۔ اگر کچھ زائد رقم خرچ ہو گئی تو میں واپس کرا دوں گا۔ اس طرح بولی اس کے نام چھوٹ گئی۔" وُہ بولے۔

"ہوں۔ خیر۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اور اس مکان کو خریدنے کا خواہش مند ہو اور بولی میں شکست کھا جانے کے غصّے میں اس نے یہ حرکت کی ہو۔"

"اوہ! اس طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے جمشید کہ میں ہمیشہ تم سے ایسے کام لینا پسند کرتا ہوں۔ انسپکٹر فضلی کے فرشتوں نے بھی شاید اس پہلو کی طرف توجہ نہیں دی ہو گی۔"

"اور اس وقت جتنے لوگ بھی بولی دینے والے موجود تھے، ان کے نام اور پتے پہلے ہی نوٹ کر لیے گئے ہوں گے۔"

"جی بالکل۔"

"وُہ فہرست مجھے مل جائے تو بہتر رہے گا۔"

"میں منگوا دیتا ہوں۔"

یہ کہ کر انھوں نے گھنٹی بجائی۔ مُلازم فوراً اندر آیا۔ انھوں نے کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے دیا:

"یہ غفور صاحب کو بھیج دو۔"

"جی بہتر۔"

تھوڑی دیر بعد وہ فہرست وہاں پہنچ گئی۔

"لاش کی تصاویر؟"

"سب کچھ انسپکٹر فضلی کے پاس ہی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ شکریہ سر۔"

"میں ایک بار پھر کہوں گا۔ یہ معاملہ اتنا اہم نہیں۔ یا تو کسی دشمن کی کارروائی ہے۔ یا پھر نیلامی کا ہی چکر ہے۔ لہٰذا تم پہلے بیوی بچوں کو تلاش کرو۔"

"وہ بھی ہو رہا ہے سر۔ ہاں۔ کیا یہ لوگ اس مکان میں منتقل ہو چکے تھے؟" انھوں نے پوچھا۔

"نیلامی ابھی چند دن پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد کچھ کارروائی ہوئی ہے۔ لہٰذا میرا خیال تو یہی ہے کہ ابھی نہیں آئے ہوں گے۔ ہاں! راحیل نے جا کر گھر کا جائزہ ضرور لیا ہو گا کہ اس میں کچھ کام کاج تو نہیں کروانا۔"

"ہوں! تب پھر میں ان کے گھر والوں سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

"میں پتا لکھ دیتا ہوں۔"

انور گردیزی نے پتا لکھ دیا اور وہ ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آئے۔

"کم از کم یہ کیس تو ایسا نہیں۔ جمشید کہ تمھیں اس کی تفتیش سے روکنے کی کوشش کی جاتی۔" خان رحمان نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں خان رحمان۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا اندازہ غلط تھا۔"

"تو پھر چھوڑو اس معاملے کو۔ اور بچوں کی طرف توجہ دو۔" پروفیسر بولے۔

"اب یہی کروں گا۔ صرف ایک چیز اُلجھن پیدا کر رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کی جیب سے کوئی چیز کیوں نہیں نکلی۔"

"بھئی آ گیا ہو گا خالی جیب۔" خان رحمان بولے۔

"خیر۔ میں اس کی لاش کو تو دیکھ لوں۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

"اور انسپکٹر فضلی سے مل کر تصاویر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے بھلا۔"

"پتا نہیں۔ یہ میری عادت ہے۔" وہ بولے۔

پہلے وہ مُردہ خانے پہنچے۔ لاش کو دیکھا۔ اس شخص کو انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ انسپکٹر فضلی کے پاس پہنچے۔ اس نے انھیں دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور بولا:

"گردیزی صاحب کا فون آ چکا ہے۔ یہ رہی تصاویر۔ دیکھ لیں۔"

انھوں نے لاش کی تصاویر کا بغور جائزہ لیا۔ لاش کے

پیر کوٹھی کی طرف تھے اور سر مخالف سمت میں ۔ گولیاں لاش
کی کمر میں لگی تھیں ۔

"آپ نے اس کی تلاشی لی تھی ؟"

"ہاں ! کوئی چیز نہیں ملی ۔"

"بالکل کوئی چیز نہیں ؟"

"ہاں ! بالکل خالی جیب تھی ۔"

"کمال ہے ۔"

"مجھے تو اس میں کمال کی کوئی بات نظر نہیں آتی ۔"

"یہ اپنی اپنی آنکھ کی بات ہے ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔
فضلی کا منہ اور بن گیا اور وہ باہر نکل آئے ۔

وہ راحیل گردیزی کے گھر پہنچے ۔ گھر میں عورتوں اور مردوں
کا ہجوم تھا اور رونے کی آواز آ رہی تھی ۔

گھر کے افراد سے تو اس وقت کچھ نہیں پوچھا جا سکتا
تھا ۔ انھوں نے ایک پڑوسی کو پکڑ لیا اور اس سے سوالات
شروع کیے :

"یہ راحیل گردیزی صاحب یہاں کب سے رہ رہے ہیں ؟"
انھوں نے پوچھا ۔

"ایک مدت سے ۔" اس نے کہا ۔

"کیسے آدمی تھے ؟"

"بہت نیک ، بہت شریف ، بہت اچھے ۔ پورے محلے
کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی ۔"

"ہوں ۔ گویا آپ کے خیال میں ان کی کسی سے کوئی دشمنی
نہیں ہو سکتی ۔ نہ ان سے کسی کو ہو سکتی ہے ۔"

"بالکل نہیں ۔ اس قسم کے تو یہ آدمی ہی نہیں تھے ۔
ہاں ایک بات اور ، وہ اپنے ملک کے بہت وفادار تھے ، بہت
ہمدرد ، ملک کے لیے سب کچھ کر گزرنے والے ۔"

"ہوں ! آپ ان کے کسی دوست کا نام پتا بتا سکتے
ہیں ؟" انسپکٹر جمشید بولے ۔

"دوست کا نام پتا تو ان کے گھر والے بتا سکیں گے ۔"

"اس وقت ان سے کچھ نہیں پوچھا جا سکتا ۔" وہ بولے ۔

"آپ یہ سوالات کیوں کر رہے ہیں ؟"

"میں اس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں ۔"

"تھوڑی دیر پہلے تو ایک اور انسپکٹر آئے تھے ۔" اس کے
لہجے میں بے یقینی تھی ۔

"ہاں ! وہ بھی کر رہے ہیں ۔ انھوں نے حال ہی میں ایک
مکان بھی نیلامی میں لیا ہے ۔"

"جی ہاں بالکل لیا ہے ۔ دراصل ان کے بہن بھائی بہت
ہیں ۔ ایک بڑے مکان کی تلاش میں تھے بہت عرصے سے ۔"

اس نے بتایا۔

"یہ لوگ کب تک وہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"چند روز تک ۔ تمام محلے والے اس خبر سے اداس تھے۔" اس نے کہا۔

"آپ تو پڑوسی ہیں۔ اندر سے گھر کے کسی ایسے فرد کو بلا سکتے ہیں۔ جو ذرا سنبھلا ہوا ہو۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔ ان کے بڑے بھائی بہت حوصلے والے آدمی ہیں۔"

"بس تو پھر انھی کو بلا لائیں۔"

وہ گیا اور ایک لمبے قد کے شخص کو بلا لایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے پہلے تو تعارف کرایا، پھر ان سے پوچھا:

"آپ مقتول کے بڑے بھائی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"آج جب راحیل گردیزی صاحب گھر سے گئے تو کچھ پریشان تھے کیا؟"

"نہیں تو۔ وہ تو بہت خوش تھے۔ اور ان کی خوشی کی وجہ وہ کوٹھی تھی۔ جو انھوں نے خریدی تھی۔ ہم چند روز

تک وہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"گھر سے وہ کیا کہہ کر گئے تھے؟"

"یہ کہ نئے گھر کا جائزہ لینے جا رہے ہیں کہ وہاں مرمت وغیرہ کا تو کوئی کام نہیں ہے۔"

"بہت خوب! آپ ان کے کسی قریبی دوست کا نام اور پتا بتا سکتے ہیں۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔ ان کا ایک بہت گہرا دوست ہے۔ راجا تنویر۔"

"یہ کہاں رہتا ہے؟"

"۱۰۹، نیو گارڈن میں۔"

انھوں نے پتا لکھ لیا اور بولے:

"بہت بہت شکریہ جناب۔"

وہ وہاں سے سیدھے نیو گارڈن پہنچے۔ مکان نمبر ۱۰۹ تلاش کرنے میں انھیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ دستک کے جواب میں ایک لمبے قد کے آدمی نے دروازہ کھولا:

"آپ راجا تنویر ہیں؟"

"جی ہاں۔ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کیسے دوست ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"آپ کے دوست کو قتل کر دیا گیا ہے اور آپ اپنے گھر میں مزے سے بیٹھے ہیں۔"

"یہ ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید کو ایک عجیب سا احساس ہوا ۔ ان آنکھوں میں حیرت کی چمک لہرا گئی۔

پسندے

جونہی وہ اندر داخل ہوا ، اس کے سر پر دو زبردست ہاتھ پڑے ، وہ تیورا کر گرا۔ اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی ۔ انھوں نے فوراً دروازہ بند کر لیا :

"یہ ۔ یہ کیا ؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"پسندے۔" فاروق بولا۔

"کیا مطلب ؟"

"اب گوشت کی ضرورت نہیں ، ہم تمھارے ہی پسندے تیار کیے دیتے ہیں۔"

"تم لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہو ، اس عمارت سے نکل نہیں سکو گے۔"

"وہ کیوں ؟"

"ابھی تو عمارت کے اندر میرے دس ساتھی موجود ہیں ۔ وہ کہاں کہاں موجود ہیں ۔ یہ تم نہیں جانتے ، جب کہ وہ تمھارے

بارے میں جانتے ہیں کہ کہاں ہو۔ لہٰذا تم ان پر قابو نہیں پا سکو گے۔ خیر فرض کر لیتے ہیں، تم ان پر قابو پا لیتے ہو، تب بھی تم اس عمارت سے باہر نہیں نکل سکو گے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس عمارت سے تو ہم آج تک باہر نہیں نکل سکے۔"

"کیا کہا؟" وہ حیران رہ گئے۔

"ہاں! دس ماہ سے ہم اس عمارت کے قیدی ہیں۔ دس ماہ پہلے باس نے، ہماری غلطی کی ہمیں سزا دی تھی۔ یہ کہ ہم اس عمارت میں ایک سال تک قید رہیں گے۔ ایک سال تک باہر نہیں نکل سکیں گے۔ ہمیں اجازت ہو گی کوشش کر کے نکل جانے کی۔ اگر نکل گئے تو اس کی طرف سے آزاد ہوں گے۔"

"اور تم لوگوں نے کوشش کی؟"

"اور دس ماہ تک ہم نے کیا کیا؟"

"حیرت ہے۔ تم کھاتے پیتے کیا ہو۔ کہاں سے کھاتے ہو؟"

"دس ماہ سے ہم ڈبوں میں بند خوراک پر گزارا کر رہے ہیں۔"

"بالکل غلط۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم ہمیں پسندوں کا گوشت لا کر دینے کی بات کس طرح کر سکتے تھے۔" بیگم جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

"اس کی وجہ بھی سن لو۔ ان ڈبوں میں کچا گوشت بھی

ہوتا ہے۔ محفوظ کیا ہوا کچا گوشت۔ یعنی اس کا پانی پہلے ہی خشک کر لیا جاتا ہے۔ لیکن پکا کر نہیں۔ اس خیال سے میں نے کہا تھا کہ پسندے بنوائے جا سکتے ہیں۔"

"خیر ہم تم لوگوں کو پسندے کھلا سکتے ہیں۔"

"کیا خاک پسندے کھائیں گے ہم۔"

"ابھی تمہارے دو ماہ باقی ہیں۔ کیا تم لوگ دو ماہ پہلے آزاد ہونا پسند کرو گے۔"

"بالکل کریں گے۔ بھلا دو ماہ اس عمارت میں گزارنا کوئی آسان کام ہے۔"

"پہلے تو یہ بتاؤ۔ خوراک کے ڈبے تم تک کس طرح پہنچتے ہیں؟"

"مہینے میں ایک بار باس اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر آتا ہے۔ گاڑی میں خوراک کے ڈبے بھی ہوتے ہیں۔ وہ ڈبے ایک ماہ چل جاتے ہیں۔ تم لوگوں کو یہاں لانے کا پروگرام اس کا نہ جانے کس طرح بن گیا۔ دس ماہ میں کوئی اور ایسا کام نہیں ہوا۔"

"ہوں۔ اچھا تو اٹھو۔ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرو۔ ہمیں اس کمرے سے نکل کر عمارت کا جائزہ لینے دو۔ ہم اس عمارت سے باہر نکلنے کا راستا تلاش کر لیں گے ان شاء اللہ!"

"میں پہلے ان سے مشورہ کر لوں۔"

"لیکن ہماری ایک شرط ہے۔" ایسے میں محمود نے کہا۔

"شرط ۔ کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"بھئی شرط کا مطلب تو شرط ہی ہوتا ہے ۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔" فاروق ہنس اٹھا۔

"بتائیں ۔ کیا شرط ہے؟"

"اب تم جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر کے نہیں جاؤ گے ۔ اس لیے کہ تم اس وقت ہمارے قیدی ہو، ہم چاہتے تو اس وقت تمھارے سر پر اس سے کہیں زیادہ زبردست چوٹ مار سکتے تھے اور تم کئی گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو جاتے ، اس وقت بھی تم ہماری مرضی کے باہر قدم نہیں رکھ سکتے ۔ اگر چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"ہوں ! اچھا ٹھیک ہے ۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ جاتا ہوں۔"

انھوں نے اسے جانے دیا اور پھر اس کے باقی ساتھی بھی وہیں آ گئے ۔

"ہم سب اس باس سے بہت تنگ آ چکے ہیں ۔ اب اگر دو ماہ یہاں ہم نے پورے کر لیے ، تو بھی اس کے لیے کام نہیں کریں گے ۔ لہٰذا ہم دو ماہ پہلے ہی یہاں سے آزادی حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔"

"اور تم آزاد ہو جاؤ گے ۔ کیا ہمیں عمارت دیکھنے کی

اجازت ہے۔"

"اجازت ہے ، لیکن ایسا نہ ہو ۔ تم خود تو نکل جاؤ اور ہمیں یہیں چھوڑ جاؤ۔"

"ہم ایسا نہیں کریں گے ۔ جو وعدہ کر لیتے ہیں ۔ پورا کر کے رہتے ہیں ۔ بلکہ ہم ایک اور وعدہ کرتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"اور وہ کیا؟"

"پہلے تمھیں باہر نکالیں گے ، پھر خود نکلیں گے۔"

"تو چلو ۔ شروع کرو کوشش ۔ ہمیں تو دس ماہ ہو گئے یہاں ٹکریں مارتے ہوئے۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو ۔ یہ عمارت کہاں ہے؟"

"ہمارے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ۔ کبھی باہر جھانک سکے ہوں تو پتا ہو نا۔" ایک بولا۔

"گویا تم اس عمارت کی چھت پر بھی نہیں جا سکے آج تک؟" محمود نے کہا۔

"نہیں ۔ یہ عمارت قلعہ نما ہے ۔ جس کی چھت پر جانے کا کوئی راستا نہیں ہے ۔ اور چھت بہت اونچی ہے ۔ دیواریں اس قدر موٹی ہیں کہ کیا بتائیں ۔ دروازہ لوہے کا ہے ۔ ہم اس کو سب مل کر بھی نہیں توڑ سکے ۔ ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"بس چٹکی بجاتے نکل سکتے ہیں۔" محمود مسکرایا۔

"وہ کیسے؟"

"یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں — دراصل، ہمیں مارا پیٹا کچھ اس بری طرح گیا کہ ہم میں ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، ورنہ یہاں سے تو ہم کب کے نکل گئے ہوتے۔"

"آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں — میں کہہ چکا ہوں کہ یہاں سے نکلنا قریب ناممکن ہے اور آپ کہہ رہے ہیں، بہت آسان ہے۔"

"ہاں! بہت زیادہ — یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر محمود نے اپنے جوتے کی ایڑی سرکائی — اور پھر دھک سے رہ گیا۔

چاقو وہاں نہیں تھا۔

"ارے! یہ کیا ہوا۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیوں! کیا ہوا — کیا غبارے سے ہوا نکل گئی۔" ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دیکھیے! اگر آپ طنز کریں گے تو ہمیں بھی طنز کرنا آتا ہے — بات دراصل یہ ہے کہ اس خانے میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا۔"

"کیا تھا — چاقو — اور آپ اس چاقو سے لوہے کا مضبوط ترین دروازہ کھول لیتے۔" اس نے طنزیہ کہا۔

"ہاں! بالکل کھول لیتے... تم اس چاقو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے... وہ سائنس کا حیرت انگیز نمونہ ہے... لیکن وہ گیا کہاں؟"

"تب پھر وہ باس کے آدمیوں نے نکالا ہو گا... باس آپ لوگوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے... اسے چاقو کے بارے میں بھی معلوم ہو گا... اور اس نے اپنے آدمیوں کو باقاعدہ ہدایت دی ہو گی کہ چاقو ایڑی میں سے نکال لینا۔"

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے... خیر... ہم اب دوسرے طریقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے... چھت پر جا کر۔" محمود نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"عقل شاید گھٹنوں میں چلی گئی ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"یہ کس خوشی میں کہا تم نے۔"

"اس خوشی میں کہ چھت پر جانے کے لیے کیا ہوا میں چھلانگ لگاؤ گے۔"

"بس دیکھتے جائیں... ہم عقل کے ذریعے جائیں گے۔"

"عقل کے ذریعے... خیر دیکھتے ہیں بھئی۔" اس نے کہا۔

باہر نکل کر انھوں نے پوری عمارت کا جائزہ لیا... یہ

بہت پرانی عمارت تھی ... اگرچہ مضبوطی اور نئے پن سے ایسا
لگتا تھا... جیسے آج ہی تیار کرائی گئی ہو... تھی بھی
قلعہ نما... بالکل قلعے کی طرز پر تعمیر کرائی گئی تھی... وہ
گولائی میں تھی... دیواریں بہت اونچی تھیں... پوری عمارت
کا صرف ایک دروازہ تھا... وہ بھی بہت موٹے لوہے
کا... چھت واقعی بہت اونچی تھی...

"یہ اونچائی کتنی ہو گی محمود..." فرزانہ نے چھت کے
درمیان رکھے گئے گول سوراخ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"قریباً تیس فٹ..." اس نے کہا۔

"اور یہ کتنے ہیں؟"

"گیارہ..." محمود نے کہا۔

"ان کی کل اونچائی... قریباً ساٹھ فٹ بنتی ہے... اگر
ساٹھ کو دو پر تقسیم کر دیا جائے تو تیس فٹ... جبکہ
ابھی ہم باقی ہیں۔"

"کیا مطلب... یہ آپ لوگ کیا حساب لگا رہے ہیں؟"
ان میں سے ایک نے حیران ہو کر کہا۔

"ابھی بتاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے انھیں انسانی سیڑھی بنانے کی ترکیب
بتائی... نیچے انھوں نے تین آدمیوں کو ایک دوسرے

کے کندھے پکڑ کر کھڑے ہونے کی ہدایت دی... جب وہ کھڑے
ہو گئے تو انھیں بیٹھ جانے کے لیے کہا... اب ان کے
اوپر دو آدمی کھڑے کیے... انھوں نے ایک دوسرے کے
کندھے پکڑ لیے... اب انھیں بھی بیٹھ جانے کے لیے کہا،
ان کے اوپر دو اور سوار کیے... ان کے اوپر فاروق چڑھا
اور بولا:

"اب آپ لوگ آہستہ آہستہ کھڑے ہو جائیں... پہلے
ہم اندازہ کر لیں کہ اب کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔"

وہ کھڑے ہونے لگے... اب بات ان کی سمجھ میں
آ چکی تھی... لہٰذا ان پر قدرے جوش طاری ہو چکا
تھا... لیکن انسانی سیڑھی کی اونچائی دیکھ کر وہ پریشان
ہو گئے... ابھی وہ صرف نصف تک پہنچ سکے تھے... گویا انھیں
اتنی ہی اونچی سیڑھی اور بنانا تھی...

"یہ تو واقعی بہت زیادہ اونچائی ہے۔"

"اور پھر... اگر ہم کسی طرح چھت تک پہنچ بھی جائیں،
تو چھت سے نیچے باہر کی طرف کیسے اتریں گے..." ان
میں سے ایک نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"وہ بعد کی بات ہے... اس کی ترکیب بھی ہم کر لیں
گے..."

"خیر... اب کیا کہتے ہو... چھت تک جانا بھی تو ہمارے لیے آسان کام نہیں ثابت ہوا۔"

"ابھی ہم نے ہمت نہیں ہاری... میرا خیال ہے... نیچے سے سیڑھی چار آدمیوں کی شروع کی جائے... چار پر تین آدمی... تین پر دو آدمی... دو پر ایک ایک آدمی... یہ ہو گئے قریباً تیس فٹ... بلکہ میں اور بڑی کرتا ہوں، دو پر پھر دو آدمی اور ایک پر پھر ایک... یہ لیجیے... ہو گئے تیس فٹ... یہ تیرہ آدمی بن گئے... جب کہ ہم پندرہ ہیں۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"عملی طور پر کام شروع کریں... بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔"

انھوں نے نئے سرے سے سیڑھی بنانا شروع کی... اور سب سے اوپر فاروق چڑھا... صرف فرزانہ اور بیگم جمشید رہ گئیں... جنھوں نے عملی طور پر حصہ نہیں لیا... نہ وہ اس میں حصہ لے سکتی تھیں... اور اس طرح فاروق کا ہاتھ چھت کے سوراخ تک پہنچ ہی گیا... اس نے سوراخ کا کنارہ دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور لٹک گیا... پھر وہ بازوؤں کے بل پر اوپر اٹھا اور سوراخ سے نکل کر چھت پر جا گرا...

"یہ ہم نے پہلی کامیابی حاصل کی ہے... کیوں دوستو؟" اس نے چہک کر کہا۔

"حیرت انگیز... ہم تو سوچ بھی نہیں سکے دس ماہ میں۔"

"خیر کوئی بات نہیں... اب سوچ لیں..." فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اب کیا سوچ لیں؟"

"وہی جو نہیں سوچ سکے۔"

"وقت نہ ضائع کرو فاروق... پہلے نیچے کا جائزہ لو... ہم کہاں ہیں؟"

"اوہ ہاں..." اس نے کہا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا... دو منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"یہ عمارت کم از کم شہر میں تو نہیں ہے۔"

"تو پھر..."

"شہر سے باہر۔"

"حیرت ہے... اس میں تو فون بھی ہے۔"

"یہ حیرت کی بات نہیں... شہر سے باہر بیس کلومیٹر تک فون لگے ہوئے ہیں۔"

"خیر... ہم باہر نکلنے کی کوشش اسی وقت کر سکتے ہیں، ہمیں یہاں کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"تو پھر کام شروع کرو۔"

"حضرت آپ لوگ اپنی اپنی قمیص اتار لیں... فرزانہ... امی جان... آپ کمرے میں چلی جائیں۔"

"قمیصیں اتار لیں... ان کا کیا کریں گے۔"

"قمیصوں کی رسی بنے گی..." فاروق مسکرایا۔

یہ بات بھی آخر ان کی سمجھ میں آ گئی... بیگم جمشید اور فرزانہ نے اپنے دوپٹے بھی باہر اچھال دیے... تاکہ وہ بھی رسے کی لمبائی میں اضافہ کر سکیں...

ان سب کی رسی بنائی گئی... پھر محمود نے اسے اوپر اچھال دیا... پہلی ہی کوشش میں وہ فاروق کے ہاتھ لگ گئی... رسی کو اوپر کھینچ کر اس نے دوسری طرف لٹکا دیا، اب سوال یہ تھا کہ اوپر والا سرا کس چیز سے باندھے... دوسری بات یہ تھی کہ باندھنے کے سلسلے میں بھی رسی کی لمبائی کم ہو جاتی... لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا... چھت بالکل صاف پڑی تھی... آخر اسے ایک طرف نال کا سوراخ نظر آ گیا... یہ بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے رکھا گیا تھا... اس نے فوراً رسی اس میں سے گزاری... گرہ لگائی... اور پھر باقی رسی نیچے گرا دی... اس نے جھانک کر دیکھا... رسی زمین سے لگتی تو نظر

نہیں آ رہی تھی... لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا، آخر اس نے اللہ کا نام لے کر اترنا شروع کیا... اترنے سے پہلے اس نے انھیں بتا دیا تھا کہ وہ نیچے اتر رہا ہے... انھوں نے اللہ حافظ کہہ کر ہاتھ ہلائے...

فاروق آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا گیا... یہاں تک کہ رسی ختم ہو گئی... اس نے نیچے دیکھا... وہ زمین سے خاص اونچائی پر نہیں تھا... چھلانگ لگائی جا سکتی تھی... اور آخر اس نے چھلانگ لگا دی... اس کے پاؤں زمین پر لگے... اور وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا... اب وہ لوہے کے دروازے کی طرف چل پڑا... اسے کافی فاصلہ طے کرنا پڑا... عمارت بہت طویل تھی... لوہے کے دروازے پر پہنچ کر اس کی سٹی گم ہو گئی... وہاں ایک بہت بڑا اور بہت پرانی طرز کا تالا لگا تھا... اس نے دروازے کی جھری پر منہ رکھ کر کہا:

"میں اس طرف پہنچ گیا ہوں... کیا تم میری آواز سن رہے ہو محمود۔"

"ہاں! سن رہے ہیں۔"

"یہاں ایک بہت بڑا اور پرانی طرز کا تالا لگا ہوا ہے... اس تالے کو کسی پتھر کی مدد سے توڑنا ممکن نہیں

ہو گا... کسی لوہار کو ساتھ لانا ہو گا۔"

"جو کرنا ہے کرو... کیا آس پاس کسی آبادی کے آثار ہیں۔" محمود نے کہا۔

"بائیں طرف جنگل میں کچھ گھر ہیں... میں ان کی طرف جا رہا ہوں... کوئی کلہاڑی وغیرہ مل گئی یا کوئی اور ایسی چیز مل گئی تو شاید اس تالے کو توڑا جا سکے... ورنہ پھر مجھے شہر جا کر مدد لانا ہو گی۔"

"ارے! کیا ہم یہاں سے فون نہیں کر سکتے۔"

"جی نہیں... ڈائل توڑا ہوا ہے... باس جب آتا ہے تو ڈائل ساتھ لے کر آتا ہے۔"

"ہوں... خیر... میں جا رہا ہوں۔"

"اللہ حافظ۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی... وہ گاؤں کے لوگوں کو ساتھ لے آیا تھا... ان کے پاس کلہاڑیاں تھیں... انھوں نے تالے پر کلہاڑیاں برسانا شروع کیں... اور آخر آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد تالا ٹوٹ گیا... ان سب نے اندر کی طرف زور لگایا... دروازہ کھل گیا... اور وہ لوگ باہر نکل آئے... ان سب کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ انھوں نے کم چہروں پر دیکھی ہو گی...

انھوں نے شہر کا رخ کیا... ایسے میں محمود نے ان سے کہا:

"دوستو! اب تمھارا فرض یہ ہے کہ قانون کا ساتھ دو... اس باس کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو... جو جانتے ہو۔"

"ہم آپ کے ساتھ ہیں... آپ ہمیں جہاں لے جانا چاہتے ہیں... پہلے وہاں لے جائیں... اپنے گھروں کو ہم بعد میں جائیں گے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

وہ پیدل چل چل کر تھک گئے... تھک کر چور ہو گئے... لیکن انھوں نے چلنا بند نہ کیا... آخر ایک بیل گاڑی انھیں مل گئی... بیل گاڑی والے نے انھیں بٹھا لیا... بیل گاڑی دو بیلوں والی تھی... پھر انھیں ایک ریڑھے والا مل گیا... وہ ریڑھے پر سوار ہو گئے... یہاں تک کہ شہری حدود تک پہنچ گئے... یہاں وہ ریڑھے پر سے اتر گئے... اس کا شکریہ ادا کیا... اور آگے بڑھنے لگے... دوپہر کا وقت تھا... شہر میں گہما گہمی کم تھی... انھیں جلد ہی ٹیکسیاں مل گئیں... اور وہ اپنے گھر پہنچے... وہاں سادہ لباس والے سے ملاقات ہوئی... وہ انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا... ٹیکسیوں کا کرایہ ادا کیا گیا اور وہ اندر آ گئے...

"یہ آپ کا گھر ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں! آپ فکر نہ کریں... ہم آپ کو کسی دوسرے کے
گھر نہیں لائے۔" فاروق مسکرایا۔

"تب ہم سب خطرے میں ہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کیا مطلب... خطرہ میں کیسے؟"

"باس کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم آپ کی مدد سے
فرار ہوئے ہیں... وہ پہلے ہی آپ کو جانتے ہیں... لہٰذا
فوراً ادھر کا رخ کریں گے۔"

"فکر نہ کرو... تمھارا باس ادھر نہیں آئے گا۔"

"اور پہلے آپ لوگوں کو اغوا کس طرح کرا لیا تھا...
اس نے...؟"

"اس وقت ہم بے خبر تھے... بے خبری میں مارے
گئے تھے۔"

"یہ کیا کہا... بے خبری میں مارے گئے تھے... تو پھر
اب کیوں بے خبری میں نہیں مارے جا سکتے... اسے اگر
صرف اتنا معلوم ہو گیا... کہ آپ لوگ ہمیں یہاں لائے
ہیں... تو وہ میاں بم بھی تو پھنکوا سکتا ہے۔"

"اوہ ہاں! یہ تو ہے... خیر... ہم ابھی انتظام کرتے
ہیں۔"

یہ کہہ کر محمود نے اکرام کو فون کیا... لیکن اکرام شہر

ان کی تلاش کے سلسلے میں گیا ہوا تھا... اس لیے
حسین آزاد سے بات ہو سکی... انھوں نے اسے پوری
ہدایات دیں اور ریسیور رکھ دیا...

"اب آپ لوگ اپنے نام اور پتے لکھوا دیں... ہم آپ
وری طور پہ ایک محفوظ مقام پہ بھجوا رہے ہیں۔ فی الحال
لوگوں کا اپنے گھروں میں جانا مناسب نہیں۔"

"ہاں! یہ تو خیر ہے۔" ایک نے فوراً کہا۔

"لہٰذا کچھ دنوں تک آپ لوگوں کو بالکل غائب رہنا
ے گا... اور وہ ہم آپ کو کریں گے... یعنی محفوظ
ہم آپ کو کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے... ہمارے لیے یہی مناسب رہے گا۔"
انھوں نے اپنے نام اور پتے لکھوا دیے... پھر
مود نے کہا:

"آپ دس ماہ سے پہلے باس کے لیے کیا کام کرتے
تھے... اور اس گروہ میں کس طرح شریک ہوئے۔"

"ہیروئن فروخت کرتے تھے... ہم نے باس سے کچھ
بے ایمانی شروع کر دی تھی... اس کا پتا اسے فوراً لگ
گیا اور اس نے ہمیں قید کر دیا... ایسے ذاتی قید خانے اس
نے اور بھی بنا رکھے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے... کوئی بہت بڑا گروہ ہے۔"

"بہت بڑے سے بھی بہت بڑا۔" ایک نے کہا۔

"ہوں! خیر... اس بڑے گروہ کے دن بھی اب گنے
چُنے رہ گئے ہیں۔"

"یہ تو خیر نہ کہیں... اس گروہ کو ختم کرنا آسان
کام نہیں۔"

"مشکل کاموں کے لیے ہی ہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔"
فاروق مسکرایا۔

"آپ کا کام آپ جانیں... ہم نے تو آپ کو خطرے
سے آگاہ کر دیا۔"

"ہاں ہاں! ہم نے سن لیا ہے... یہ بتاؤ... گروہ میں
شامل کیسے ہوئے... کیا اس سے پہلے بھی جرائم پیشہ زندگی
گزار رہے تھے۔"

"توبہ کریں جی... ہم تو بالکل ایمان دارانہ زندگی گزار
رہے تھے... کہ اچانک ہمیں پولیس نے پکڑ لیا اور ہم
پر ہیروئن کا کیس بنا دیا... ہم نے کبھی خواب میں بھی
ہیروئن نہیں پی تھی... نہ خریدی تھی... نہ فروخت کی
تھی... لیکن ہم پر کیس بن گیا اور مزے کی بات یہ کہ
اس کیس میں ہمیں سزا بھی ہو گئی اور کسی نے ہماری

بات نہ سنی... سزا کاٹ کر باہر نکلے تو کسی نے گلے سے
نہ لگایا... صرف اس باس نے گلے سے لگایا اور پیش کش
کی کہ اس کے گروہ میں شریک ہو جائیں... ہم ہو گئے... مرتے
کیا نہ کرتے... نوبت تو فاقوں تک پہنچی ہوئی تھی... کوئی
عزت دینے کے لیے تیار نہیں تھا... ہم سب کی بس
یہی کہانی ہے۔"

"اچھی بات ہے... ہم ابھی آپ کی حفاظت کا انتظام
کرتے ہیں۔"

جلد ہی وہاں محمد حسین آزاد پہنچ گیا... اس کے ذریعے
ان دس آدمیوں کو ایک خفیہ ٹھکانے بھیج دیا گیا... تاہم
اس سے پہلے انھوں نے اس سب انسپکٹر اور انسپکٹر کے نام
وغیرہ نوٹ کر لیے تھے... جنھوں نے انھیں جیل بھجوایا
تھا... ان کے جانے کے بعد محمود نے کہا:

"ہم اس کیس پر کام جاری رکھیں گے۔"

"تو پھر چلو... یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے... امی جان
آپ یہاں ٹھہریں گی... اور پوری طرح چوکس رہیں گی،
آپ صرف جانی پہچانی آواز سن کر دروازہ کھولیے گا۔"

"اچھی بات ہے... فکر نہ کرو۔" وہ مسکرائیں۔

سادہ لباس والا اب گھر سے باہر آ کر ڈیوٹی دینے

لگا... انھوں نے اسے بھی ہدایات دیں... ایسے میں انھیں
اچانک ایک خیال آیا... یہ کہ ان کے ساتھ جو ہنگامہ
آرائی کی گئی... اس کی آواز بیگم شیرازی تک کیوں نہ گئی
"بیگم شیرازی سے بھی دو دو باتیں کر ہی لی جائیں"
محمود نے کہا۔
"کیا ابا جان کو یہ خیال نہیں آیا ہو گا۔" فرزانہ بولی۔
"ضرور آیا ہو گا... لیکن انھیں آنٹی نے کیا بتایا،
ہمیں معلوم نہیں۔"
"ٹھیک ہے۔"
محمود نے آگے بڑھ کر بیگم شیرازی کے دروازے پر
دستک دی... ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا... وہ
اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے... اس لیے کہ
ان کے گھر میں تو ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا
تھا...
"آنٹی سے ملنا ہے۔"
"وہ نہیں ہیں گھر میں۔"
"اچھا... کہاں گئی ہیں۔"
"بازار گئی ہیں... اور کچھ سہیلیوں سے بھی ملنا تھا...
رات سے پہلے نہیں لوٹیں گی۔"

"آپ کون ہیں... ان کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں رہتا۔"
"میں ان کی دور کی خالہ ہوں۔"
"ہم اپنی آنٹی کا گھر اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔"
"شوق سے دیکھ لیں... انھوں نے مجھے تم لوگوں کے
بارے میں بتا دیا تھا۔" بڑھیا نے خوش ہو کر کہا۔
انھوں نے گھر کا جائزہ لیا... کہیں کسی گڑبڑ کے آثار
نظر نہ آئے... ایسے میں انھیں بیگم شیرازی کے سٹور روم
کا خیال آیا... اس کمرے میں وہ اپنے گھر کی تمام بے کار
چیزیں پھینک دیتی تھیں... اور اس کے دروازے پر کبھی
تالا نہیں لگا ہوتا تھا... لیکن آج انھیں اس دروازے پر
تالا لگا نظر آیا تھا...
"یہ تالا آنٹی نے کب لگایا؟"
"کیوں! کیا بات ہے..." بڑھیا کے لہجے میں حیرت تھی۔
"اس کمرے کے دروازے پر تو وہ کبھی تالا نہیں
لگاتی تھیں۔"
"اوہ! اس کا مطلب ہے... انھوں نے مجھ پر اعتماد
نہیں کیا۔" بڑھیا نے اداس انداز میں کہا۔
"کیا مطلب؟" محمود بھی چونک کر بولا۔
"میری آمد کی وجہ ہی تالا لگایا ہو گا۔"

"کھولو بھئی فاروق..." محمود نے سرسری انداز میں کہا۔

"کیا تم لوگ یہ دروازہ کھولو گے۔" بڑھیا نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"ہاں! بالکل کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا... یہ گھر آپ کی آنٹی کا ہے۔" اس نے کہا۔

فاروق نے اپنی ماسٹر چابی سے تالا کھولا اور پھر وہ اندر داخل ہو گئے... دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا... اندر بیگم شیرازی بندھی ہوئی پڑی تھیں اور ان کے منہ پر ٹیپ چپکا دی گئی تھی... تاکہ وہ آواز نہ نکال سکیں... دوسرے یہ کہ وہ بے ہوش بھی تھیں... انھیں ضرور کوئی چیز سونگھائی گئی تھی...

"یہ سب کیا ہے محترمہ۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب... اپنی آنٹی سے ہی پوچھ لو... مجھے کچھ معلوم نہیں۔" بڑھیا مسکرائی۔

"گویا آپ کو یہ تک معلوم نہیں کہ یہ اس کمرے میں کیوں بندھی پڑی ہیں؟"

"ہاں! نہیں معلوم،" اس نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"پتا نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

ان کے منہ بن گئے... اور پھر وہ انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے... لیکن وہ ہوش میں نہ آ سکیں... آخر انھیں ڈاکٹر کو فون کرنا پڑا... بڑھیا اس دوران پر سکون انداز میں ایک طرف بیٹھی رہی... اس نے کوئی دخل اندازی نہیں کی... نہ گھبراہٹ ظاہر کی... اس بات پر ان کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا...

آخر ڈاکٹر صاحب وہاں پہنچ گئے... انھوں نے پہلے تو ان کا معائنہ کیا... پھر ایک دوا روئی پر لے کر سنگھائی۔

"یہ کیا ڈاکٹر صاحب... آپ انجکشن نہیں لگائیں گے۔"

"نہیں بھئی... انجکشن کی ضرورت نہیں... اگر یہ اس دوا کے سنگھانے سے ہوش میں آ گئیں... تو ٹیکہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پہلے تو آپ نے کبھی دوا نہیں سنگھائی... ایسے موقعوں پر..." محمود نے کہا۔

"میں نے اب ہومیو پیتھک کورس بھی کر لیا ہے، اور اس طرح میں ان دواؤں سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔"

اسی وقت بیگم شیرازی نے آنکھیں کھول دیں۔

"کمال ہے... اس دوا نے تو ٹیکے سے بھی جلدی

کام دکھا دیا۔"

"اسی لیے میں نے انجکشن نہیں لگایا تھا۔" وہ مسکرائے۔

"ہم... میں... کہاں ہوں اور مجھے کیا ہوا تھا۔"

"پتا نہیں... یہ تو آپ بتائیں گی... کہ آپ کو کیا ہوا تھا۔"

"ارے! میری آنٹی کہاں ہیں۔" بیگم شیرازی بولیں۔

"میں یہاں ہوں میری بچی۔" بڑھیا نے سامنے آتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا آنٹی؟"

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی... مجھے تو تم نے بتایا تھا کہ میں اپنی سہیلیوں سے ملنے جا رہی ہوں... پھر تم اس کمرے میں بندھی ہوئی کس طرح مل گئیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی... مجھے کچھ یاد نہیں... ہاں اتنا یاد ہے... ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا اور پھر میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اپنی سہیلیوں کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"بالکل ٹھیک... پھر تم چلی گئی تھیں۔" بڑھیا نے کہا۔

"اگر یہ چلی گئی تھیں تو کیا سٹور روم سے ہمیں نقلی آنٹی ملی ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"میں خود بھی اتنی ہی حیران ہوں... جتنے کہ تم لوگ۔"

"حیران ہو لیں... اس لیے کہ حیران ہونے سے صحت بہت اچھی رہتی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اچھا بھئی... میں تو چلتا ہوں... اب یہاں میرا کوئی کام نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"جی ضرور۔" وہ بولے۔

ڈاکٹر صاحب تو چلے گئے... انھوں نے بیگم شیرازی کو بستر پر لٹا دیا... اور خود بڑھیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری آنٹی گھر سے باہر نہیں گئیں۔"

"تب پھر؟" وہ بولی۔

"تم نے انھیں بے ہوش کر دیا اور رسیوں سے باندھ کر اس کمرے میں بند کر دیا... اور اوپر سے تالا لگا دیا۔"

"یہ تمھارا خیال ہے... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"آنٹی... یہ کون صاحبہ ہیں؟"

"میری دور کی خالہ۔" انھوں نے کہا۔

"یہ بات آپ کو پہلے سے معلوم ہے... کہ آپ کی کوئی دور کی خالہ موجود ہیں۔"

"نہیں... یہ بات تو مجھے انھوں نے ہی بتائی تھی۔" بیگم شیرازی نے بتایا۔

"اور آپ نے یقین کر لیا۔"

"تو اور کیا کرتی... ایک اکیلے آدمی کو اگر دور کی کوئی
خالہ ساتھ دینے کے لیے مل جائے... تو یہ تو اس کے
لیے بہت خوشی کی بات ہوتی ہے... تنہا رہ رہ کر میں
تنگ آ چکی ہوں۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے... اب ہم اس عورت سے
نبٹ لیں گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولیں۔

"مطلب یہ کہ اسی نے آپ کو بے ہوش کیا تھا، اور
اس کمرے میں بند کیا تھا۔"

"لیکن انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں اور کیا... بھلا کیا ضرورت تھی مجھے ایسا کرنے کی۔"
بڑھیا خوش ہو کر بولی۔

"آپ کو بے ہوش کرنے کی ضرورت تھی اسے... کیونکہ
ساتھ والے گھر میں ایک زبردست ہنگامہ ہونا تھا، اور
آپ اس ہنگامے کی طرف ضرور متوجہ ہوتیں... اس کے
علاوہ یہ یہاں رہ کر ایک عدد مورچہ بھی سنبھالے ہوئے
ہے۔"

"کیا کہا... مورچہ سنبھالے ہوئے ہے۔" بیگم شیرازی کے

لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

جی بالکل... پل پل کی خبریں اپنے ساتھیوں کو دینے کے
لیے یہ مورچہ بہت ہی بہترین ہے۔"

"اوہ! اوہ!"

"تم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو... میں واقعی سلطا
کی دور کی خالہ ہوں۔"

"ہوں گی... ہم آپ کی تلاشی لیں گے... اگر کوئی قابلِ
اعتراض چیز نہ ملی تو ہم آپ کی بات مان لیں گے... محمود
نے جل بھن کر کہا۔

"بلکہ خود بھی آپ کو اپنی نزدیک کی خالہ مان لیں گے۔"
فاروق مسکرایا۔

"نہیں بھئی... میں تو نزدیک کی نہیں مانوں گی... دور
کی ہی ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"تم دور کی مان لینا... میں نزدیک کی... آخر ہمارا جا
کیا رہا ہے۔"

"ارے تم دیکھ نہیں رہے... یہ محترمہ گھر کی مالک بن
بیٹھی تھیں... جب کہ گھر کی مالکن رسیوں سے بندھی پڑی
تھیں... یہ حال تو صرف دور کی خالہ ماننے پر ہے... اور
اگر کہیں ہم نے نزدیک کی خالہ مان لیا تو نہ جانے محترمہ

کیا گل کھلا بیٹھیں۔"

"گل تو میں ایسے کھلاؤں گی کہ پورا گھر مہک اٹھے گا۔" بڑھیا نے کہا۔

"سنا آپ نے۔"

"آخر یہ کیا چیز ہے؟"

"اس وقت ہم جس کیس سے دوچار ہیں... یہ اس کیس کے مجرموں میں سے ایک ہے... اور ان کی نزدیکی ساتھی ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے..." محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا بھی ہو سکتا ہے۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا... ذہن درمیان میں رہ گیا ہے۔" محمود نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"سنا فرزانہ... اب ان کا ذہن درمیان میں رہنے لگا... ہے کوئی تک۔"

"اور میں نے اپنے کام بند کب کر رکھے ہیں۔" فرزانہ اٹ اس پر الٹ پڑی۔

"ہاں بالکل... پوچھو اس سے فرزانہ۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"دیکھا... ہمیں لڑانے کی چال ہے یہ... جب کہ ہمیں ابھی ان محترمہ سے لڑائی کرنی ہے... خیال ہے کہ ہمیں دانتوں

پسینہ آ جائے گا... لہذا محترمہ سے لڑتے ہیں۔"

"ارے... یہ بہت اچھا ہو جائے گا... یوں بھی دانتوں پسینہ آئے بہت دن ہو گئے ہیں... میں تو تنگ آیا ہوا تھا... کہ نہ جانے کیا بات ہے... دانتوں پسینہ ہی نہیں آ رہا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"یار کبھی تو سنجیدہ بھی ہو جایا کرو۔" محمود جل گیا۔

"میں تو سر سے لے کر پیر تک سنجیدہ ہوں۔" فاروق بولا۔

"اچھا بھائی مان لیا... تم سنجیدہ ہو... اور ہم دونوں غیر سنجیدہ... اب ذرا ہمیں ان محترمہ سے بات کر لینے دو۔" یہ کہ کر محمود بڑھیا کی طرف مڑا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب چیز تھی... عین اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی...

کیسی عمارت

"تو آپ کو ابھی اطلاع نہیں ملی۔" انھوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اگر اطلاع ملی ہوتی تو میں یہاں ہوتا... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں... میرے پیارے دوست راحیل کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں جناب... کیا آپ جانتے ہیں... راحیل صاحب انور گردیزی کے رشتے دار بھی تھے... لیکن دور کے۔"

"ہاں! اس نے ایک بار بتایا تو تھا... یہ کہ انور گردیزی اس کے چچا لگتے ہیں۔"

"بس تو پھر آپ کے دوست کی لاش انھی کے دروازے پر پڑی ملی ہے... وہ وہاں کسی کام سے گئے تھے کہ ان پر کسی نے فائرنگ کر دی۔"

"اوہ!" راجا تنویر کے منہ سے نکلا... اب اس کا چہرہ

دھواں دھواں نظر آ رہا تھا۔

"ان کا قتل شام پانچ بجے کے قریب ہوا ہے... پانچ بجے سے پہلے انھوں نے آپ کو فون نہیں کیا تھا؟"

"جی فون... بالکل نہیں۔"

"یا وہ خود یہاں آپ سے ملنے تو نہیں آئے تھے؟"

"جی نہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے... اب ہم چلتے ہیں... اگر آپ ہمیں کوئی کام کی بات بتا سکیں تو فون کر دیجیے گا... یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔" انھوں نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

وہ وہاں سے چلے آئے...

"جمشید... تم حیران کس بات پر ہوئے تھے؟"

"قتل کی خبر اس شخص کو تھی... لیکن یہ حضرت پھر بھی انجان بن رہے تھے... آخر کیوں... انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر انھیں اطلاع تھی تو یہ وہاں کیوں نہیں گئے... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کا عزیز ترین دوست قتل کر دیا جائے اور وہ گھر میں بیٹھا رہے؟"

"تب یہ مطلبی دوست ہو گا... دوست کی زندگی میں تو فائدہ اٹھانے کے لیے دوست بنا لیا ہو گا... مرنے کے

بعد یہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکے گا بھلا...؟

"ہوں ... ضرور یہی بات ہو گی ... اور کیا کہا جا سکتا ہے"
پروفیسر داؤد بولے۔

"بہر حال! میں اس شخص کی نگرانی کرانے کی ضرورت محسوس
کر رہا ہوں ... ہو سکتا ہے، اس کا اس معاملے سے کوئی
تعلق نہ ہو ... لیکن اگر ممکن ہے تو نگرانی کرانے کی صورت
میں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے کار میں لگے فون کے ذریعے چند
ماتحتوں کو ہدایات دیں ... پھر گھر فون کیا ... اور زور سے اچھلے

"ہائیں ... بیگم ... تم ... تم لوگ آ گئے۔"

"ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آئے ہیں۔"

"محمود وغیرہ کہاں ہیں۔"

"اغوا کرنے والوں کا سراغ لگانے کے چکر میں ابھی ابھی
گھر سے باہر نکلے ہیں۔"

"ہم آ رہے ہیں ... اگر وہ باہر ہوں تو ان سے کہہ دو...
کہیں نہ جائیں۔"

"جی بہتر!" انھوں نے کہا۔

انسپکٹر جمشید ریسیور رکھ کر ان کی طرف مڑے:

"یہ لوگ تو گھر پہنچ بھی چکے ہیں۔"

"ان لوگوں کو زیادہ دیر تک قید رکھنا ممکن بھی تو نہیں
ہے" خان رحمان مسکرائے۔

"ان سے ملنے والی معلومات کے سہارے ہم آگے بڑھ
سکیں گے ... ان شاء اللہ" وہ بولے۔

وہ گھر پہنچے ... باہر سادہ لباس والا موجود تھا ... وہ فوراً
نزدیک آ گیا:

"کیا خبر ہے بھئی۔"

"محمود، فاروق اور فرزانہ صاحبان سامنے والے گھر میں گئے
تھے ... اب تک نہیں لوٹے ... کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"اوہو اچھا ..." یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید بیگم شیرازی کے
دروازے پر پہنچے ... اور دستک دی ... جلد ہی قدموں کی آواز
سنائی دی ... اور اسی بڑھیا کی شکل نظر آئی:

"اندر میرے بچے موجود ہیں۔"

"آپ کے بچے ... میں سمجھی نہیں۔"

"دو لڑکے اور ایک لڑکی ... تھوڑی دیر پہلے ہی تو اندر
گئے ہیں۔"

"آپ کو ضرور کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔" بڑھیا نے
منہ بنایا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھے۔

"اندر کوئی نہیں ہے... بے شک دیکھ لیں... ابھی بیگم
شیرازی بھی نہیں لوٹیں۔"
"ہٹ جائیے ایک طرف... ہم اندر کی تلاشی لیں گے۔"
"وہ تو آپ پہلے بھی لے چکے ہیں..." اس نے کہا او
ایک طرف ہٹ گئے۔
انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی... انھوں نے مُ
کر سادہ لباس والے کی طرف دیکھا اور اشارے سے اُ
بلایا:
"یس سر!"
"اس عورت کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ تینوں اندر نہیں گئے"
"تب یہ محترمہ جھوٹ بول رہی ہیں... میں نے اپنی آنکھو
سے دیکھا ہے... انھیں اندر جاتے ہوئے۔"
"خیر... تم بھی اندر آجاؤ بھئی۔" انھوں نے سادہ لبا
والے سے کہا۔

وہ چاروں اندر داخل ہوئے... پورے گھر کی تلاشی لی
گئی... لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ کہیں بھی نظر نہ آئے...
انھوں نے سادہ لباس والے کو اوپر چھت پر بھی بھیجا...
وہ وہاں بھی نہیں تھے... ایسے میں انسپکٹر جمشید نے کہا:
"ایک کمرہ رہ گیا... اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا

ہے... آپ کے پاس اس کی چابی تو نہیں ہوگی!"
"جی نہیں۔" اس نے کہا۔
انسپکٹر جمشید نے اپنی چابی سے تالا کھولا، پھر جونہی انھوں
نے دروازہ دھکیلا، تو دھک سے رہ گئے... محمود، فاروق، فرزانہ
اور بیگم شیرازی اندر بے ہوش پڑے تھے... وہ دوڑ کر
ان کے پاس پہنچے اور پھر انھیں جلدی جلدی باہر لانے
لگے... انھیں مسہری پر لٹا کر انھوں نے ڈاکٹر کو فون کیا...
اور پھر خود بھی انھیں ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے،
لیکن... وہ ہوش میں نہ آئے... آخر ڈاکٹر صاحب وہاں پہنچ
گئے... ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے:

"کمال ہے۔"
"کیا کمال ہے؟"
"آج اس گھر میں ہو کیا رہا ہے جناب... تھوڑی دیر پہلے
گرور صاحب نے مجھے فون کر کے یہاں بلایا تھا... اس
وقت یہ خاتون بے ہوش تھیں... میں نے انھیں ایک
دوا سنگھائی تھی... اور یہ ہوش میں آگئی تھیں... پھر
میں تو چلا گیا تھا... اب یہ سب بے ہوش ہیں۔"
"ہاں! شاید ان کے ساتھ وہی عمل دہرایا گیا ہے۔"
"اور گھر میں ان محترمہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے..." یہ

کر کر انسپکٹر جمشید بڑھیا کی طرف مڑے... اور حیرت زدہ رہ گئے... اس کے ہاتھ میں کوئی عجیب سی چیز تھی...

○

"یہ کیا ہے... اور تم کون ہو؟"

"میرے ذمے ایک کام لگایا گیا تھا... یہ کہ بیگم شیرازی کوئی گڑبڑ نہ کر سکیں... میں نے انھیں اس قابل نہیں چھوڑا۔ پھر آپ یہاں آئے... اور گھر کو دیکھ کر چلے گئے... آپ نے اس کمرے کو نہیں دیکھا جس پر تالا لگا ہوا تھا، لیکن جب آپ کے بچے یہاں آئے تو انھوں نے اس کمرے کو بھی کھول کر دیکھنا پسند کیا... اس لیے کہ انھوں نے اس کمرے کے دروازے پر کبھی تالا نہیں دیکھا تھا... ان کا یہاں اکثر آنا جانا رہتا ہو گا... خیر... انھوں نے بیگم شیرازی کو اندر سے نکالا... ہوش میں لانے کی کوشش کی، اور پھر ڈاکٹر کو بلایا... میں خاموشی سے دیکھتی رہی... لیکن جب آپ کے بچوں نے مجھ پر شک کیا اور میری طرف متوجہ ہو گئے... تو مجبوراً مجھے انھیں بھی بے ہوش کرنا پڑا... بالکل اسی طرح، جس طرح اب میں آپ سب کو بھی بے ہوش

ر رہی ہوں..."

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں پکڑی چیز کو دبا دیا... اس میں سے سفید رنگ کی دھوئیں جیسی گیس نکلی... اور وہ تڑا تڑ گرتے چلے گئے... انسپکٹر جمشید سب سے آخر میں گرے... اس لیے کہ وہ سانس روک چکے تھے، لیکن ان کی کوشش زیادہ دیر کامیاب نہ ہو سکی... کیوں کہ دھواں تھا کہ کمرے سے چھٹ ہی نہیں رہا تھا... یوں محسوس ہوتا تھا... جیسے ٹھہر گیا ہو... اور پھر وہ بھی بے ہوش ہو گئے۔ اس وقت بڑھیا نے ہاتھ میں پکڑی چیز پر سے دباؤ ہٹا لیا، اور گیس پھر سے اس میں سمٹ آئی... اب وہ گول سی غبارے نما چیز، اس کی جیب میں چلی گئی...

اس کام سے فارغ ہو کر وہ فون کی طرف بڑھی... کسی کے نمبر گھمائے اور بولی:

"بازی میرے ہاتھ رہی باس... اب یہ سب لوگ بے ہوش ہیں، اور میں آپ کی ہدایات سننا چاہتی ہوں۔"

"بہت خوب! تم میرے گروہ کی سب سے بہترین کارکن ہو۔ تمھیں جب بھی جو کام سونپا گیا... تم نے بہت خوبی سے کیا... اور اس مرتبہ تو تم نے انسپکٹر جمشید کو بھی چکمہ دے دیا۔" باس نے کہا۔

"شکریہ باس... آپ کے یہ الفاظ میرے لیے سونے سے زیادہ قیمتی ہیں۔" بڑھیا بولی۔

"سونا کیا چیز ہے... خیر میں گاڑی بھیج رہا ہوں... ان سب کو میرے پاس لے آؤ... اسی خفیہ ٹھکانے پر۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا اور پھر سلسلہ کٹ گیا... اچانک بڑھیا چونکی... ابھی ایک کام رہ گیا تھا... وہ مسکرائی اور گھر سے نکل آئی... اس نے انسپکٹر جمشید کے دروازے پر دستک دی... بیگم جمشید نے اندر سے پوچھا:

"کون ہے؟"

"میں ہوں... بیگم شیرازی کی آنٹی... آپ کے بچے اور شوہر اس وقت ان کے ہاں ہیں... اور آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے... میں آ رہی ہوں... میرے آنے میں ایک منٹ لگ جائے گا... کیوں کہ..." وہ کیوں کہ سے آگے کچھ نہ کہہ سکیں... کیوں کہ جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا... لیکن وہ بولنا نہیں چاہتی تھیں۔

"ٹھیک ہے... میں سمجھ گئی... آپ فارغ ہو کر وہاں آ جائیں... میں چلتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔"

قدموں کی آواز سنتے ہی... انھوں نے دفتر فون کیا... سرگوشی کے انداز میں اکرام کو فوراً پہنچنے کی ہدایت کی، یہ بھی کہا کہ بہت سے آدمی ساتھ لے کر آئے... اب وہ چھت پر آئیں... اپنی چھت کے ذریعے بیگم شیرازی کی چھت پر اتریں... ضرورت کے تحت یہ خفیہ راستا چھتوں کے ذریعے ان لوگوں نے بنا لیا تھا... وہ اس سے ہوتے ہوئے دبے پاؤں نیچے اتریں اور پھر نیچے کا منظر دیکھ کر کانپ گئیں۔ انھیں خوف بھی محسوس ہوا... کیوں کہ اگر سیڑھیوں پر ان کی ذرا بھی آہٹ ہو جاتی تو وہ بڑھیا کے شکنجے میں آ جاتیں... انھوں نے دیکھا... ان کے سب ساتھی فرش پر بے ہوش پڑے تھے... اور بڑھیا بے تابانہ انداز میں ٹہل رہی تھی... وہ دبے پاؤں واپس پلٹیں اور چھت پر آ گئیں، انھوں نے خفیہ راستا بند کر دیا اور خود اس چھت پر ہی رہ گئیں... اب وہ نیچے اترتے ہوئے ڈر رہی تھیں... نہ جانے کیا بات تھی... انھیں بڑے بڑے مجرموں سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا... لیکن اس بڑھیا کو دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی تھی...

اور پھر بڑھیا ایک بار پھر باہر نکلی... کیوں کہ ایک منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا... اور وہ اس کے پاس

نہیں پہنچی تھیں... انھوں نے بڑھیا کو دستک دیتے سنا
اب وہ اس کی دستک کے جواب میں کچھ نہیں بول سکی
تھیں... بڑھیا نے دو تین بار دستک دی اور دروازے
کے تالے کے سوراخ پر جھک کر کچھ کرنے لگی...

ایسے میں اچانک ایک آواز ابھری:

"محترمہ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

یہ آواز اکرام کی تھی... بڑھیا چونک کر مڑی:

"م... میں... ز... اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا... بیگم
جمشید نے تھوڑی دیر پہلے تو اندر سے جواب دیا تھا... اب
نہیں بول رہیں... ضرور اندر کوئی گڑبڑ ہے۔"

"آپ ہیں کون؟"

"میں بیگم شیرازی کی خالہ ہوں... دور کی۔"

"دور کی... کیا مطلب؟" اکرام بے خیالی کے عالم میں
بولا۔

"میرا مطلب ہے... میں کوئی نزدیکی رشتے دار نہیں ہوں
اب اکرام نے گھنٹی بجائی... اور ساتھ میں منہ سے آواز
بھی نکالی:

"بھابی صاحبہ آپ کہاں ہیں؟"

"میں یہاں ہوں... بیگم شیرازی کی چھت پر..." اوپر سے

بیگم جمشید نے جواب دیا۔
دونوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور پھر بڑھیا نے وہاں سے
دوڑ لگا دی...

"ارے ارے... یہ نہ جانے پائے... پکڑو اسے... بہت بڑی
راز ہے یہ۔" بیگم جمشید چلائیں۔
اکرام نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی... اس کے ماتحت بھی
دوڑ پڑے... لیکن ان کی حیرت کی حد نہ رہی... دیکھتے ہی
دیکھتے بڑھیا ان سے بہت دور نکل گئی تھی...

"واپس جاؤ... اور گاڑی لے کر آؤ... یہ بڑھیا نہیں چھلاوا
ہے۔" اکرام چلایا اور خود دوڑ جاری رکھی... اس کے دو ماتحت
گاڑی کی طرف دوڑے... اور جلد ہی گاڑی لے آئے، لیکن
اس وقت تک بڑھیا نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی...
انھوں نے گاڑی اس طرف دوڑا دی... بہت دوڑ دھوپ
کے بعد بھی بڑھیا کا کوئی سراغ نہ ملا... اب وہ واپس چلے...
انھوں نے بیگم شیرازی کے دروازے پر ایک اور بڑی گاڑی
کھڑی دیکھی... اور کوئی شخص کھڑا آہستہ آہستہ دستک دے
رہا تھا... گاڑی کے پچھلے حصے میں چھ آدمی اور بیٹھے نظر
آئے... اکرام نے فوراً خطرے کو بھانپ لیا اور اپنے آدمیوں
کو رک جانے اور پھر پوزیشن لینے کا اشارہ کیا...

"بالکل ٹھیک اکرام... ان لوگوں کو گرفتار کرنا ہے۔" بیگم
جمشید نے اوپر سے کہا۔

گاڑی پر بیٹھے ہوئے افراد بوکھلا اٹھے... اسی وقت ان پر
فائرنگ شروع ہو گئی... کیوں کہ اکرام ان کے ہاتھوں میں
جدید ترین رائفلیں دیکھ چکا تھا اور ذرا سی بھی سستی خود
ان سب کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی...

خود اس نے گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر بے کار کر دیے۔
فائرنگ کی آوازوں نے آس پاس کے لوگوں کی سٹی گم کر
دی... گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں جلدی جلدی بند
ہونے لگے... مجرم گاڑی میں سے دبکے فائرنگ کر رہے تھے،
گاڑی کو تو اب وہ نکال کر لے جا نہیں سکتے تھے... اور
خود بھی بری طرح گھر گئے تھے... کیوں کہ ان کے سامنے
انسپکٹر جمشید اور بیگم شیرازی کے گھروں کی دیواریں تھیں، اور
پیچھے اکرام کے آدمی تھے... دونوں گھروں کے دروازے
پہلے ہی بند تھے... بیگم شیرازی والے گھر کا دروازہ موقع
ملتے ہی بیگم جمشید اندر سے بند کر چکی تھیں...

اکرام نے وائرلیس کے ذریعے اور فورس طلب کر لی، اور
جلد ہی وہ پورا علاقہ پولیس سے بھر گیا... سپیکر پر مجرموں
کو صورتِ حال بتا دی گئی کہ اب وہ لوگ بچ نہیں سکتے...

پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے... آخر انھوں نے
ہتھیار ڈال دیے...

آدھ گھنٹے بعد وہ اب انسپکٹر جمشید کے سامنے بیٹھے تھے...
ہوش میں لائے جانے کے بعد انھیں ساری کہانی سنا دی
گئی تھی... ساری کہانی سن کر وہ بولے:

"اس بڑھیا کو فرار نہ ہونے دیتے اکرام... یہ سب بے شک
فرار ہو جاتے۔"

"بس سر! کیا بتاؤں... اگر مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوتا
تو شاید ایسا نہ ہوتا۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں... پروا نہ کرو... ہاں بھئی... تم کیا کہتے
ہو... کیا بتا سکتے ہو... یہاں تمھیں کس نے بھیجا تھا؟"

"باس نے... اور ہم اس کا نام نہیں جانتے۔"

"اکرام... گاڑی کا نمبر نوٹ کر لو... اور فوراً معلوم کرو
کہ گاڑی کس کی ہے۔" وہ بولے۔

"او کے سر۔"

"اس طرح بھی آپ کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔" ان
میں سے ایک نے کہا۔

"کیوں؟" انھوں نے اسے گھورا۔

"اس لیے کہ گاڑی کا مالک بھی باس کے بارے میں

کچھ نہیں جانتا۔"

"ہمارا ایک طریقہ کار ہے... ہم اس کے مطابق کام کرتے ہیں۔"

"ضرور کریں کام۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی کا مالک بھی حاضر کر دیا گیا...

"یہ گاڑی جو باہر کھڑی ہے... آپ کی ہے؟"

"ہاں جناب! یہ چوری ہو گئی تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کرائی؟"

"نہیں جناب! میں بہت مصروف آدمی ہوں... بس آج کل آج کل میں ایک ہفتہ گزر گیا... آج ارادہ تھا، رپورٹ درج کرانے کا... کہ آپ نے طلب فرما لیا۔"

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر پوچھا۔

"بس جی... کام کیا کرنا... شہر میں گاڑیوں کی ایک بڑی ورکشاپ ہے... نئی پرانی گاڑیاں خریدتا ہوں... بیچتا ہوں، اور مرمت بھی کرتا ہوں۔"

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ آپ کے پاس تو بہت سی گاڑیاں ہوتی ہوں گی... پھر آپ نے اپنی ذاتی گاڑی کیوں بھیجی۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"اس وقت اتفاق کی بات... کوئی گاڑی موجود نہیں

تھی۔" اس نے کہا۔

"انھیں گاڑی دے کر کس لیے بھیجا تھا... اور رائفلیں دے کر۔"

"میں نے... نہیں جناب... میں بتا چکا ہوں... یہ گاڑی۔"

"اکرام... یہ حضرت لاتوں کے بھوت ہیں۔" انھوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"سب کو لے چلیں۔"

"ہاں!" وہ بولے۔

"کیا مطلب... آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں... دیکھیے ہمارے ساتھ کوئی غیر قانونی کام نہ ہو... ورنہ۔"

"اچھا... تو آپ ورنہ کہنا بھی جانتے ہیں... بھئی کمال ہے... اچھا یوں کرو... کہ پہلے تم جو کرنا چاہتے ہو... کر لو... پھر میں اپنا کام شروع کروں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ زور سے چونکا۔

"اگر تم اپنی مدد کے لیے کسی کو فون کرنا چاہتے ہو یا کسی کو بلانا چاہتے ہو... تو اجازت ہے... یہ فون حاضر ہے۔" انھوں نے کہا۔

"جی... کیا... واقعی۔"

"ہاں... بالکل۔"

وہ فون پہ اس طرح جھپٹا... جیسے گدھ کسی مردہ جس
پر... اور پھر جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے کے بعد ب
"انسپکٹر جمشید مجھ پر ظلم کرنے چلے ہیں... بچا سکتے ہیں
بچا لیں." یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا.
"اب چلیے تم وہ فون نمبر بتاؤ گے... جس پر فون کیا ہے
انسپکٹر جمشید مسکرائے.
"نہیں بتاؤں گا." وہ یک دم شیر ہو گیا.
"اکرام... تم اسے نمبر بتاؤ." وہ بولے.
"کیا مطلب؟" گاڑی کے مالک نے چلا کر کہا.
"مطلب یہ کہ... اگر تم نمبر نہیں بتاتے، نہ بتاؤ... ہم تمہیں
وہ نمبر بتا دیتے ہیں... جس پر تم نے رنگ کیا ہے... بلکہ
کہو تو میں تمھیں کہیں فون کیے بغیر نمبر بتا دوں."
"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے." اس نے کھوئے کھوئے انداز
میں کہا.
"تم نے نمبر بہت تیزی سے ڈائل کیے تھے... لیکن میری
نظریں تم پر تھیں... لہٰذا میں نے نوٹ کر لیا... اگر نوٹ
نہ کر سکتا تو بھی کیا ہے... ایکس چینج سے بھی فوراً
نمبر بتا دیے جاتے... خیر... اکرام... تم ایکس چینج سے
معلوم کرو... میں کاغذ پہ وہ نمبر لکھتا ہوں."

اکرام نے فون کا ریسیور اٹھا لیا... اس نے کاغذ پہ نمبر نوٹ
کر لیا... ادھر انسپکٹر جمشید نے لکھا ہوا نمبر اس کاغذ کے برابر
رکھ دیا... دونوں نمبر ایک تھے... اب انھوں نے دونوں کاغذ
گاڑی کے مالک کے سامنے رکھ دیے... اس کی آنکھیں حیرت
اور خوف سے پھیل گئیں... انسپکٹر جمشید نے نمبر جیب میں
رکھ لیے اور بولے:
"اکرام... ایک دو تین."
"او کے سر."
"یہ ایک دو تین کیا ہوا."
"ابھی معلوم ہو جائے گا."
اکرام نے انھیں آن کی آن میں ایک گاڑی میں منتقل
کیا اور ہوا ہو گیا... وہ اپنی بڑی گاڑی میں ان کے
پیچھے روانہ ہو گئے...
"وہ نمبر کس کا تھا جمشید." خان رحمان بے تابانہ بولے.
"مجرم کا." انھوں نے کہا.
"بہت خوب... جواب پسند آیا... مجرم کا نام."
"نام کے لیے تمھیں انتظار کرنا ہو گا."
"بس تم میں یہی بات بُری ہے."
"میں آج بیگم کے کارنامے کے بارے میں سوچ رہا ہوں."

ورنہ اس وقت ہم مجرم کے قبضے میں ہوتے۔"

"کوئی بات نہیں ... مجرم ہمیں قبضے میں لے کر بھی کچھ نہ کر سکتا۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

جلد ہی وہ ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے.... انھیں وہاں قید کر دیا گیا... خود بھی وہ کچھ دیر تک وہیں رہے، پھر انسپکٹر جمشید نے گھر کے نمبر ڈائل کیے... دوسری طرف سے بیگم جمشید کی آواز سن کر انھوں نے آواز بدل کر خفیہ الفاظ میں انھیں بتایا کہ وہ بول رہے ہیں... ادھر سے انھوں نے بھی گول الفاظ میں بات کی:

"ہمارے یہاں سے روانہ ہونے کے بعد کسی کا فون تو نہیں آیا؟"

"کوئی ایک فون... یہاں تو فونوں کی لائنیں لگی ہیں۔"

"تو پھر تم نے انھیں کیا جواب دیا؟"

"یہ کہ میں نہیں جانتی... سب لوگ کہاں گئے ہیں... کہیں گئے ضرور ہیں... اس لیے کہ گھر میں نہیں ہیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت خوب! جواب پسند آیا... یہی جواب دیتی رہو۔"

"اچھی بات ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ دیا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے،

"ہمیں ابھی اپنا کام کرنا ہے ... آیئے چلیں۔"

وہ اسی وقت باہر نکل کر شہر کی طرف چل پڑے... جونہی شہر میں داخل ہوئے... انھیں روک لیا گیا...

"کیا بات ہے؟" انھوں نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔

"آپ کے لیے آئی جی پنجاب کا پیغام ہے... آپ فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں۔"

"اچھی بات ہے... بہت بہت شکریہ۔" انھوں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"یہ کیا شروع ہو گیا؟"

"کام... ہم اپنا کام کریں گے... مجرم اپنا اور آئی جی صاحب اپنا۔"

"آخر بات کیا ہے... کچھ بتاؤ بھی تو۔"

"بہت بڑی بات ہے... پہلے میں ایک دو آدمیوں کو چیک کر لوں... پھر بتاؤں گا اور پھر ہم آئی جی صاحب سے بھی ملاقات کریں گے۔"

جلد ہی ان کی گاڑی ایک عمارت کے سامنے رکی... محمود، فاروق اور فرزانہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا...

سوئی اٹک گئی

عمارت ایک چھوٹے سے ملک کا سفارت خانہ تھا... انسپکٹر جمشید تو خیر یہاں پہلے آ چکے تھے... محمود، فاروق اور فرزانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا...

"کیا اس سفارت خانے سے بھی موجود کیس کا کچھ تعلق ہے۔" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں! اس کیس کا تعلق تو نہ جانے کس کس عمارت اور کس کس شہر سے ہے... اصل مسئلہ ہے ثبوت حاصل کرنے کا اور شاید ہمیں ثبوت حاصل کرنے کے سلسلے میں دانتوں پسینہ آ جائے۔" انھوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ابا جان! ہم دانتوں پسینہ آنے سے نہیں ڈرتے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"بات ڈرنے کی نہیں... اگر پختہ ہاتھ نہ ڈالا تو ہمارا ملک تباہ ہو جائے گا۔"

"جی... کیا مطلب؟"

"مطلب بھی بتا دوں گا... تم فکر نہ کرو۔"

اسی وقت اندر سے ان کا بلاوا آ گیا... جلد ہی وہ سفیر کے کمرے میں تھے... سفیر کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے... اس نے بھنا کر کہا۔

"انسپکٹر جمشید! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں یہ چاہتا ہوں سر... کہ ہمارے اس غریب ملک پر رحم کریں... آخر آپ اس ملک کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"آپ ہمارے ملک کے خلاف سنگین کارروائیوں میں مصروف ہیں..." انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"اس کا ثبوت؟"

"چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ کے سامنے ثبوت پیش کر کے آپ کو اپنے ملک سے فارغ کرا رہا ہوں۔"

"بھول ہے آپ کی... آپ مجھے ہلا بھی نہیں سکیں گے۔" اس نے کہا۔

"آپ کا نام نامی روجر ہے... اور میرا نام انسپکٹر جمشید... یہ بات نوٹ کر لیں۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں

کہا... اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے...

ٹائی روجر انھیں غصے کے عالم میں تکتا رہ گیا...

"یہ ملاقات سمجھ میں نہیں آئی..."

"میں نے کہا تھا نا... کہ ثبوت حاصل کرنا بہت مشکل کام ثابت ہو گا... میں اس مشکل کام کو آسان بنانے کی کوشش میں ہوں... چوبیس گھنٹے کی دھمکی اسے ضرور پریشان کرے گی... اور یہ اپنی جگہ سے حرکت ضرور کرے گا اور میرے آدمی نہایت خفیہ انداز میں اس کی نگرانی کر رہے ہیں... اس کی کارروائیوں کی رپورٹ ملتے ہی ہم اس پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"ایک تو سفیروں کے ساتھ یہ بڑی مصیبت ہے کہ ہم انھیں سزا نہیں دلوا سکتے... زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں واپس بھیج دیا جاتا ہے... ناپسندیدہ شخص کہہ کر، ہے کوئی تک... اس رعایت کی وجہ سے یہ لوگ جو جی میں آئے کرتے ہیں... یہاں تک کہ ایک بڑے ملک کے سفیر نے گزشتہ دنوں اسلام دشمن ایک جماعت کے سربراہ سے خفیہ ملاقات کی... اب کوئی ان سے پوچھے کہ جناب سفیر تو ہیں آپ ہمارے ملک میں... پھر ملک کے خلاف سرگرمیوں کی آپ کو کس نے اجازت دے دی... آپ کا تو کام

ہے، اپنے ملک کی نمایندگی کرنا... لیکن یہ پوچھنا تو حکومت کا کام ہے... اور حکومت بڑی طاقتوں کے دباؤ میں ہے، سچ تو یہ ہے... ان حالات میں مجھے اپنے ملک پر بہت ترس آنے لگا ہے... بڑے بڑے طوفان اس پر ڈالے جا رہے ہیں اور یہ غریب ہے کہ ہر طوفان کا مقابلہ جواں مردی سے کر رہا ہے..."

"سوال یہ ہے کہ یہ سفیر صاحب ملک کے خلاف کن سرگرمیوں میں مبتلا ہیں۔" محمود نے پوچھا۔

"بہت بھیانک... بہت خوفناک۔" وہ بولے۔

"معلوم ہو گیا... آپ ابھی کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"آپ سادہ لباس والوں کی بجائے... ہمیں کیوں ان سفیر صاحب کی نگرانی پر مقرر کر دیتے... ہمیں بھی تو اب کوئی کام نہیں ہے۔" ایسے میں محمود نے کہا۔

"اگر تم یہ پسند کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... لیکن تم ان سادہ لباس والوں کے ساتھ مل کر یہ کام کرنا، آسانی رہے گی۔"

"او کے سر۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

اور پھر سفارت خانے سے ذرا فاصلے پر انھوں نے انھیں اتار دیا اور ماتحتوں کو ان کے بارے میں ہدایات

بھی دی... رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے اس عمارت
کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کیں... جس میں انھیں
قید کیا گیا تھا... اور سیدھے وہاں پہنچے... عمارت اب
بالکل خالی پڑی تھی... اس سے معلوم کرنے پر بھی اس
کے مالک کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا... آخر وہ
سٹیلمنٹ کے دفتر پہنچے... وہاں کے سب سے عمر رسیدہ آدمی
سے ملاقات کی...

"شہر سے باہر جنوبی سمت میں ایک بہت پرانی عمارت ہے،
بہت بڑی عمارت جو قلعہ نما ہے... اس کا دروازہ بہت مضبوط
لوہے کا ہے... ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ عمارت
کس کی ہے۔"

"میں ابھی دیکھ کر بتاتا ہوں... ویسے میں اس عمارت کو
کسی زمانے میں دیکھ چکا ہوں..." بوڑھے کلرک نے کہا۔

"بہت خوب! یہ تو اور بھی مزے کی بات ہوگی۔" انسپکٹر
جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

پرانے ترین رجسٹروں میں دیکھنے کے بعد اس نے کاغذ
کا ایک ٹکڑا ان کی طرف بڑھا دیا...

"یہ عمارت اس شخص نے کسی مغل شہزادے سے خریدی
تھی... اس کے باپ دادا اس عمارت کے بنانے والے

ے..." بوڑھے کلرک نے کہا۔

"ہوں..." انسپکٹر جمشید بولے... خریدنے والے کا نام انھوں نے
ہلے کبھی نہیں سنا تھا... اس کا نام تھا... زاہد کھوڑہ...

"زاہد کھوڑہ... بھلا میں اس شخص سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

"یہاں اس کا وہ پتا بھی لکھا ہے... جو اس نے رجسٹری
وقت لکھوایا تھا... آپ اس پتے پر چیک کر لیں... شاید
معلوم ہو جائے۔"

"اچھی بات ہے... آپ کیا مدد کر سکتے ہیں... اس عمارت
بارے میں۔"

"پراپرٹی ٹیکس جب لگایا گیا تو اس شخص زاہد کھوڑہ
جانے کیسے ٹیکس بالکل معاف کرایا تھا... غالباً کوئی بہت
ی سفارش ڈھونڈی تھی اس نے... آپ اس پتے پر تلاش
لیں... شاید کوئی سراغ مل جائے۔"

"آپ کا مطلب ہے... کاغذات کی رو سے ابھی وہی
خص مالک ہے؟"

"جی ہاں! بالکل۔"

زاہد کھوڑہ کا پتا تلاش کرنے میں انھیں بہت دقت ہوئی،
ر مل گیا... لیکن وہاں تالا لگا ہوا تھا... پڑوسی کے دروازے
پر دستک دی گئی... ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا:

"ہاں جی... کیا بات ہے۔" اس نے پوچھا۔
"آپ کے پڑوسی زاہد کھوڑہ صاحب کہاں گئے ہیں؟"
"یہ کوئی آج کے گئے ہوئے ہیں۔"
"تو پھر..." انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ایک مدت ہوئی... یہ یہاں سے چلے گئے تھے
کیا کہہ کر گئے تھے۔"
"کسی نے جاتے ہوئے دیکھا ہو تو معلوم بھی ہو۔"
"اس کا مطلب ہے... کسی کو ان کے بارے میں کچھ
معلوم نہیں کہ کہاں گئے ہیں۔"
"ہاں بالکل۔"
"اور یہ گھر ان کا اپنا تھا؟"
"ہاں! یہ انھوں نے خریدا تھا... اسی لیے تو آج تک
تالا لگا ہوا ہے... شریف آدمی اگر اتنے لمبے عرصے کے
لیے جانا تھا... تو اپنا مکان ہی کرائے پر دے جاتے۔"
"ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں... آپ ان صاحب کا
حلیہ بتا سکتے ہیں۔"
"خیر تو ہے جناب... کیا آپ کا تعلق پولیس سے ہے؟"
"یہی سمجھ لیں۔" محمود نے کہا۔
"وہ ایک لمبے قد کے پتلے دبلے سے آدمی تھے... لمبی

سی ناک، کافی چوڑی پیشانی... بڑی بڑی آنکھیں..." اس
نے بتایا۔
"ہوں... شکریہ... جاؤ بھئی... کھولو تالا... اندر کا بھی
جائزہ لے لیں۔"
"کیا کوئی گڑبڑ ہے صاحب۔"
"نہیں... لیکن گڑبڑ ہو بھی سکتی ہے۔"
تالا کھولا گیا... اندر ہر چیز پر مٹی ہی مٹی جمی تھی...
ان کے لیے مکان کا جائزہ لینا مشکل ہو گیا... اندر کی ہر
چیز سے دولت مندی ٹپک رہی تھی... یوں لگتا تھا جیسے
خریدنے والے نے خوب دل کھول کر پیسے خرچ کیے ہوں،
لیکن ان قیمتی چیزوں کے علاوہ اور کوئی کام کی چیز نہ
مل سکی جو ان کے کام آ سکتی... نہ کوئی کاغذ... نہ کوئی
ڈائری... آخر وہ مایوس ہو کر باہر نکل آئے... پڑوسی اب
تک باہر موجود تھا۔
"کچھ ملا جناب۔"
"نہیں... ارے ہاں! ہم نے آپ سے یہ نہیں پوچھا...
ان کے ساتھ اور کون کون رہتا تھا۔"
"وہ بالکل اکیلے تھے جناب... اس بارے میں میری
ان سے بات چیت بھی ہوئی تھی... انھوں نے بتایا تھا،

وہ پوری دنیا میں اکیلے ہیں... بلکہ انھوں نے ایک دن یہ بھی کہا تھا... وہ تو مغلیہ دور کی آخری نشانی ہیں... اس پر میں نے کہا تھا... آخری کیوں... کیا آپ شادی نہیں کریں گے... آپ کے بچے بھی تو مغلیہ دور کی نشانی ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"نہیں! میری بیوی فوت ہو گئی... میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی... اور میں دوسری شادی کر کے اپنی مرحوم بیوی سے دھوکا نہیں کر سکتا... میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دوسری شادی نہیں کروں گا... وہ بھی شاہی خاندان سے تھی۔" اس نے بتایا۔

"ہوں! اچھا جناب... ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی۔" تالا پھر سے لگا کر وہ واپس لوٹے...

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بار یا ہر جگہ کچھ ضرور ہو۔" محمود نے اسے گھورا۔

"اس میں گھورنے کی تو کوئی بات نہیں... کیوں فرزانہ۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"ہاں! کوئی نہیں ہے... لیکن بلاوجہ بھی گھورا تو جا ہی سکتا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اب ہم اس زاہد کھوڑہ کو کہاں تلاش کریں... دوسری بات یہ اس کا کیس سے آخر کیا تعلق ہو سکتا ہے... وہ قلعہ نما عمارت اس نے چھوڑ دی ہو گی... آخر یہ مکان جو خریدا... تو رہنے کے لیے ہی خریدا ہو گا... گویا اس قلعے میں رہنے کا پروگرام اس نے ختم کر دیا تھا... یوں بھی قلعہ شہر سے بہت دور ہو گیا تھا۔"

"تب پھر اس نے قلعہ فروخت کیوں نہ کر دیا۔"

"قیمتی چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے... وہ کوئی غریب آدمی نہیں ہے۔"

"تب پھر اس نے پراپرٹی ٹیکس کیوں معاف کرایا... دولت مند آدمی جو اس طرح خرچ کر سکتا ہے... پراپرٹی ٹیکس کی کیا پروا کرے گا..." فرزانہ بولی۔

"اس میں الجھن ضرور ہے... خیر ہم اس پر غور کریں گے۔ میں نے زاہد کھوڑہ کا حلیہ نوٹ کر لیا ہے... ہو سکتا ہے ہماری اس سے بہت جلد ملاقات ہو جائے۔" انسپکٹر جمشید عجیب انداز سے مسکرائے۔

"جی کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"اس میں مطلب... مطلب کی کیا بات ہے... بس میں نے ایک بات کر دی۔"

ہم لوگوں کو وہاں قید کیا گیا... اس کا مطلب ہے... اس عمارت کو کام میں تو لایا جا رہا ہے... ارے ہاں... آپ نے وہاں سے انگلیوں وغیرہ کے نشانات تو اٹھوا لیے ہوں گے۔"

"یہ کام اکرام کا تھا... اور اس نے ضرور اپنے آدمی وہاں بھیج دیے ہوں گے... اس بڑھیا کی انگلیوں کے نشانات بھی بیگم شیرازی کے گھر سے اٹھوائے ہوں گے، اکرام اتنا کچا نہیں... ایسے کام تو وہ ہدایت دیے بغیر بھی کرتا ہے۔"

عین اسی وقت ان کے فون کی گھنٹی بجی... انسپکٹر جمشید نے ریسیور اٹھایا... کار خان رحمان چلا رہے تھے...

"السلام علیکم۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"سر! یہ میں ہوں... نمبر ۱۹... راجا تنویر قلعے کی طرف جا رہا ہے... میں اس کے تعاقب میں ہوں۔"

"بہت خوب! تعاقب جاری رکھو... ہم آ رہے ہیں۔" انھوں نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"یہ نئی بات معلوم ہوئی... راجا تنویر کا کوئی تعلق اس قلعے سے ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا... وہ اس سمت تو جا رہا

...ضروری نہیں کہ قلعے میں ہی جائے۔" محمود نے کہا۔

"خیر... یہ تو معلوم ہو جائے گا... ہم ایک اہم کام بھول گئے ہیں... اور اگر ہم نے اس کیس کی تفتیش اس طرح سے کی ہوتی تو شاید اب تک کیس حل ہو چکا ہوتا۔" فرزانہ نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" محمود اور فاروق ایک ساتھ بولے۔

"ہم نے عمارت میں مقرر کیے گئے مجرموں کے ساتھیوں کو ...یز جگہ پہنچا دیا ہے... انھیں اس قلعے میں قید کیا گیا تھا، ایک سال کی سزا دی گئی تھی... ہم تو وہاں لگے ہاتھوں بھیج دیے گئے تھے... ان آدمیوں کا بیان ہے کہ انھیں بالکل جھوٹے ہیروئن کے کیس میں پھانسا گیا تھا، اور انھیں سزا دلوا دی گئی تھی... سزا بھگت کر جب وہ جیل سے نکلے تو معاشرہ تو انھیں قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا... باس ہی ایسا آدمی تھا... جس نے انھیں اپنے گروہ میں شامل کیا اور بہت بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھا... سوال یہ ہے کہ وہ پولیس آفیسر جو ایک مدت سے یہ کام کر رہے ہیں... کیا وہ اس باس کو نہیں جانتے ہوں گے... کیا باس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

"باس کو جاننا ضروری نہیں... تعلق ضرور ہو گا... وہ
سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہوں گے... کیوں کہ تربیت
یافتہ جرائم پیشہ جیل میں تیار ہونے کے بعد باس کو مل
جاتے ہیں... وہ کہیں اور جا بھی نہیں سکتے..." محمود
نے کہا۔

"چلو یونہی سہی... چیک کر لینے میں کیا حرج ہے... ان
لوگوں نے ان انسپکٹرز صاحبان کے نام پتے اور فون نمبر
وغیرہ بتائے ہیں... میرا خیال ہے... ہم باری باری ان
سے مل لیتے ہیں۔"

"یہ پروگرام بہت اچھا رہے گا۔" پروفیسر داؤد نے خوش
ہو کر کہا۔

وہ پہلے پتے پر پہنچے... نام تھا انسپکٹر رضا کاظم... ریٹائر
ہو چکے تھے اور نظر بھی کم آنے لگا تھا... بائیں ہاتھ پر
ایک عدد پھوڑا نکلا ہوا تھا... جس پر رومال ڈالے ہوئے
تھے... پوچھنے پر بتایا:

"یہ میرے اعمال کی دنیا میں سزا ہے... آخرت میں
جو سزا ملے گی... وہ ابھی باقی ہے... توبہ کرتا ہوں، لیکن
قبول کیسے ہو... پہلے تو معافی ان لوگوں سے مانگنا ہو
گی... جن پر اپنی انسپکٹری کے دوران ظلم کیے ہیں...

بے تحاشا ظلم... بالکل بے گناہ لوگوں کو بھی مجرم بنانے کا جرم
کرتا رہا ہوں... اب جو لوگ خود مجرم بن چکے ہیں... وہ
مجھے کیا معاف کریں گے... اور کر بھی دیں تو مجھے معافی
کس طرح مل سکتی ہے... اس لیے کہ انھوں نے جن لوگوں
پر ظلم کیا ہے... جن لوگوں کو نشے کا عادی بنایا ہے... جن
لوگوں کے پورے خاندانوں کو برباد کیا ہے... وہ مجھے کس
طرح معاف کر دیں گے... اور میں کس کس کے پاس جاؤں
گا... معافی مانگنے کے لیے... لہٰذا یہ سزا تو مجھے مل کر رہے
گی... میں لاکھ کوشش کروں... کوئی حل نہیں نکلے گا...
اب حالت یہ ہے کہ پھوڑا کسی طرح بھی بھرتا نہیں...
ختم نہیں ہوتا... لگاتار رستا رہتا ہے... اور اس میں اس
قدر جلن ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں... یوں لگتا ہے جیسے اس
میں آگ لگی ہوئی ہے... شاید یہ جہنم کی آگ کا ایک چھوٹا
سا نمونہ ہے... نمونہ۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"سوال یہ ہے کہ آپ کو یہ ظلم کرنے کے لیے کہا کس
نے تھا... یہ خیال کسی نے دیا ہو گا... تبھی آپ نے کرنا
شروع کیا ہو گا نا۔"

"ہاں! بالکل... لیکن افسوس... میں اسے نہیں جانتا...
ہاں میں اس کی آواز سن لوں تو پہچان سکتا ہوں۔"

اس نے کہا۔

"کیا مطلب ..." انسپکٹر جمشید چونکے۔

"اگر میں اس شخص کو باتیں کرتے ہوئے سنوں... فوراً بتا دوں گا کہ یہی وہ شخص ہے... جو مجھ سے یہ گھناؤنا کام کرا رہا ہے... ایک آدمی کو سزا دلوانے کے بدلے میں وہ مجھے دس ہزار روپے دیتا رہا ہے... گویا گمراہ کرنے کا ریٹ فی آدمی دس ہزار روپے طے تھا... اور اس کے رشتے داروں سے جو ملتا تھا... وہ الگ رہا..."

"گویا آپ جن کو پھانستے تھے... ان کے رشتے داروں سے بھی رشوت لیتے تھے۔"

"ہاں!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن کیسے... انھیں تو آپ بچانے کی کوشش کرتے ہی نہیں تھے۔"

"پھنسے ہوئے لوگ ہماری باتوں اور ہمارے وعدوں پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں... لہذا ہماری جیب بھرتے چلے جاتے ہیں۔"

"اوہ! ظلم در ظلم۔"

"بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر۔"

"افسوس! صد افسوس!" پروفیسر داؤد نے دکھ بھرے انداز

ں کہا۔

"خیر... آپ اس کی آواز کس طرح پہچان لیں گے؟"

"وہ مجھ سے فون پر کھل کر باتیں کرتا رہا ہے۔"

"لیکن ہو سکتا ہے... وہ آواز بدل کر باتیں کرتا رہا ہو۔"

پکٹر جمشید نے اعتراض کیا۔

"ہاں! یہ بات کہی جا سکتی ہے... لیکن یہ بات بعد میں بت ہو گئی تھی... کہ وہ آواز بنا کر بات نہیں کرتا تھا۔"

س نے بتایا۔

"اور یہ بات کس طرح ثابت ہو گئی تھی؟" فاروق کے ے میں حیرت تھی۔

"اس طرح کہ... ایک بار فون پر ہی وہ کسی دوسرے سے بات کرنے لگ گیا تھا... اور ریسیور پر اس نے ہاتھ نہیں رکھا تھا... میں کافی دیر تک اس کی آواز سنتا رہا... وہ باتیں سنتا رہا... جو وہ کسی دوسرے سے کرتا رہا تھا... وہ باتیں تو مجھے اب یاد نہیں... لیکن ان سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ آواز بدل کر بات ہرگز نہیں کرتا۔"

اس نے کہا۔

"کیا وہ باتیں آپ کو یاد نہیں۔"

"نہیں ... یہ بہت مدت کی بات ہے۔"

"اگر بہت مدت کی بات ہے تو کیا ہوا... آپ ذہن پر زور دے کر ان کو یاد کر سکتے ہیں ... اس کا دماغ قدرت کا انوکھا شاہکار ہے ... اور پھر یہ بھی تو سوچیے ... اگر آپ کی کوشش سے وہ اصل مجرم گرفتار ہو جاتا ہے... تو شاید اللہ آپ کو معاف کر دے ... اور آپ اس پھوڑے سے نجات پا لیں۔"

"میں ... ضرور کوشش کروں گا ... اور ... اور ... اور..." اس نے کہا۔

"ہائیں! یہ کیا... ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ سوئی اٹکنے کا مرض صرف ہم میں ہی ہے..." فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"ان کی باتوں کا مطلب سمجھنا... آسان کام نہیں... لہذا آپ مطلب کے چکر میں نہ پڑیں... اور ہمیں بتائیں... آپ کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئے۔"

"مجھے وہ گفتگو یاد آ گئی ہے... آپ کی بات... دماغ والی بات سنتے ہی نہ جانے کیا ہوا... میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا... اور وہ گفتگو لفظ بہ لفظ یاد آ گئی ہے۔"

"اوہ!" وہ ایک ساتھ بولے۔

"تو پھر بتایئے... وہ کیا گفتگو تھی..." محمود نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"ہاں ضرور... کیوں نہیں..." اس نے کہا... اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی...

کیا بات ہے

اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا... پھر وہ تڑپ سے گرا
اور ساکت ہو گیا:

"قاتل جانے نہ پائے۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔
وہ یک دم باہر کی طرف دوڑے... لیکن اس وقت تک
قاتل کی کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی...

"اب وہ دوسرے انسپکٹروں کی طرف بھی جائے گا..."
فرزانہ چلائی۔

"اوہ... اوہ... تو پھر دوڑو..." محمود نے بلند آواز میں
کہا۔

"اس طرح دوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں... وہ ہم سے
آگے ہے... باری باری سب کو ہلاک کر دے گا... ہمیں
سب پتوں پر ایک ساتھ پہنچنا چاہیے... وہ سب پتوں
پر ایک ساتھ نہیں پہنچ سکتا..." فرزانہ نے جلدی جلدی

کہا۔

"بہت خوب فرزانہ..." انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔
ان کے پاس کل تین پتے اور تھے... انسپکٹر جمشید نے
جلدی جلدی کاغذ کے تین ٹکڑے کیے... ایک خود لے کر
دوڑ پڑے... باقی دو میں سے ایک پرزہ محمود نے لیا اور
خان رحمان کو ساتھ لے کر دوڑ لگا دی... تیسرا پرزہ باقی
لوگ لے کر دوڑ پڑے...

فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد جب اپنے والے پتے
پر پہنچے تو اس انسپکٹر نے انھیں حیران ہو کر دیکھا، کیونکہ
ان کے چہروں پر ہوائیاں دوڑ رہی تھیں...

"خیر تو ہے... آپ لوگ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔"

"آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے... وہ انسپکٹر رضا کاظم
کو قتل کر چکا ہے اور باقی انسپکٹروں کی طرف روانہ ہو
چکا ہے... ہم نے آپ تک پہنچنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ
کی ہے... کہ کہیں... فاروق... تم باہر ٹھہرو... جلدی کرو۔"
فرزانہ رک کر اس کی طرف مڑی۔

"اوہ! اچھا۔" فاروق بولا اور فوراً باہر چلا گیا...

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" انسپکٹر نے گھبرا کر کہا۔
فرزانہ نے جلدی جلدی اسے ساری بات بتائی، اور پھر

ایک اندرونی کمرے میں بند ہو گئے... اندر سے دروازے لگا لیے
گئے... اب گھر سے باہر فاروق کھڑا تھا... اور اندر وہ تینوں
فاروق بہت چوکنا تھا... پستول اس کی جیب میں بالکل تیار تھا
اور اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا... اندر فرزانہ اور
پروفیسر داؤد بالکل وہی کہانی سن رہے تھے جو انسپکٹر رضا کاظم
نے بیان کی تھی... آخر میں آواز کی بات آئی... تو اس
نے کہا:

"ہاں! میں اس کی آواز سن سکتا ہوں... اس لیے کہ
وہ فون پر مجھ سے بات کرتا رہا ہے۔"
"لیکن ہو سکتا ہے... وہ آواز بدل کر بات کرتا رہا ہو۔"
"اوہ ہاں! اس کا زبردست امکان ہے... لیکن میرے
پاس اس کا کوئی حل نہیں... اگر میں وہ آواز سن لوں گا تو
فوراً بتا دوں گا کہ یہی وہ آواز ہے... اور اگر وہ آواز
بدل کر بولتا رہا ہے... تب تو وہ آواز مجھے سنائی ہی نہیں
دے گی؟"

"اوہ ہاں! یہ بات بھی بالکل ٹھیک ہے۔" فرزانہ چونکی۔
"تب پھر کیا کریں۔" پروفیسر داؤد بولے۔
"انھیں یہاں سے اپنے ساتھ لے چلتے ہیں... تاکہ ان
کی جان کو کوئی خطرہ نہ پیش آئے... یہاں تو بہر حال

اس کے آ دھمکنے کا زبردست امکان ہے۔"
"ہاں! ٹھیک ہے... چلیے جناب... آپ ہمارے ساتھ۔"
"لیکن پہلے آپ اپنے باہر والے ساتھی سے باہر کی رپورٹ
تو لے لیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے..." یہ کہہ کر فرزانہ بیرونی دروازے پر
آئی۔
"ہیلو فاروق... باہر کیا حال ہے۔" اس نے دروازہ کھولے
بغیر پوچھا۔
"ہر طرح خیریت ہے... دور دور تک کوئی خطرہ نہیں۔"
اس نے بتایا۔
"اچھی بات ہے۔"
اس نے دروازہ کھول دیا... اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر
پہنچے... انسپکٹر کو فوراً محفوظ کمرے میں پہنچا کر دروازہ اندر
سے اور باہر سے بند کر دیا گیا... جلد ہی انسپکٹر جمشید بھی
ایک انسپکٹر کو لے کر پہنچ گئے اور بولے:
"نہیں بھئی... وہ اس طرف تو آیا نہیں... تمھاری طرف
کیا رہا۔"
"ادھر بھی نہیں آیا۔"
"تب پھر شاید وہ اس طرف گیا ہو گا... جس طرف محمود

اور خان رحمان گئے ہیں...." وہ بولے۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی... انداز محمود کا تھا

"لیجیے... وہ بھی آ گئے۔"

اطمینان کر لینے کے بعد انھوں نے دروازہ کھول دیا
اب گھر میں تین انسپکٹر جمع ہو گئے... تینوں کی کہانی بالکل
ایک تھی... ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہ تینوں بھی کسی نہ
کسی گھناؤنے اور لاعلاج مرض میں مبتلا تھے... ایک کی
ٹانگ ہر وقت سڑی رہتی تھی... اور اس کا کوئی علاج نہیں
ہو پاتا تھا... دوسرے کے سر میں اس قدر شدید درد
اٹھتا تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا تھا... تیسرے کی ناک کی
ہڈی گل گئی تھی اور اس میں سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا
تھا... وہ ہر وقت رومال ناک پہ رکھ کر پانی اس
میں جذب کرتا رہتا تھا...

یہ انجام ان کا دیکھ کر وہ کانپ کانپ گئے:

"موجودہ انسپکٹروں کو جا جا کر اگر آپ لوگ اپنی ساری
کہانی سنائیں... اور اپنی حالتیں انھیں بتائیں اور دکھائیں اور
وہ ظلم سے باز آ جائیں تو شاید آپ کے گناہوں کا کفارہ
ہو جائے۔" انسپکٹر جمشید نے انھیں ترکیب بتائی۔

"سر! ہم یہ بھی کریں گے۔" ایک نے کہا۔

"اچھا! اب میں آپ تینوں کو آوازیں سنانے کا انتظام کرتا
... آپ لوگ منہ سے کچھ نہیں بولیں گے... جونہی وہ آواز
... ہاتھ سے اشارہ کر دیں۔"

"بہت بہتر۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

انسپکٹر جمشید نے اپنے سامنے وہ ٹیلی فون سیٹ رکھ لیا،
...کی آواز پورے کمرے میں سنی جا سکتی تھی.... اب
...وں نے باری باری اس کیس سے متعلق لوگوں کو فون
...نا شروع کی... ہر ایک کی آواز سن کر وہ انکار میں
...ہلاتے چلے گئے...

"اب صرف ایک آدمی رہ گیا ہے... اب میں اسے
...ن کرتا ہوں۔" انھوں نے فون کیا... لیکن دوسری طرف سے بتایا گیا
...ر وہ گھر میں نہیں ہیں۔"

"اب انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں سر... ہم انتظار کریں گے..." ان میں
...ے ایک نے کہا۔

اس کے بعد بھی انسپکٹر جمشید نے کئی بار وہ نمبر گھمائے،
لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا... دوسرے دن کے اخبار میں
انھوں نے ایک خبر پڑھی تو چونک اٹھے... اور اپنے

ساتھیوں سے بولے:

"ہمیں اب خود کچھ کرنا پڑے گا... فون پر وہ شخص
آئے گا... غالباً اسے اندازہ ہو چکا ہے کہ ہم کیا
چاہتے ہیں۔"

"تو پھر... آپ کا پروگرام کیا ہے؟"

"اسے گھیر لینے کا... اس کے گرد جال مضبوط کرنے
کا... میں ابھی تیاری شروع کرتا ہوں۔"

اور وہ کام میں جُت گئے... کئی گھنٹے بعد کہیں جا
وہ فارغ ہوئے... اس کے بعد انھوں نے اِدھر اُدھر
کئی جگہ فون کیے اور پھر ان سب کو ساتھ لے کر
روانہ ہوئے:

"کیا ہم مجرم کی طرف جا رہے ہیں ابا جان؟" محمود نے
پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہاں! باقی لوگ بھی وہاں پہنچ جائیں گے اور باہر
ٹھہر کر ہمارا انتظار کریں گے... پھر ہم ایک ساتھ مجرم
کے سامنے جائیں گے۔"

"بہت خوب! اس کا مطلب ہے... آپ اپنا کام پکا
کر چکے ہیں۔"

"ہاں! یہ تو میرا اصول ہے... جب مجرم کے گرد

مکمل ہو جاتا ہے... اس وقت میں اس پہ ظاہر کرتا
... کہ ہم تم تک پہنچ چکے ہیں۔"

آخر ایک جگہ پہنچ کر انھوں نے گاڑی روک دی... یہ
چھوٹا سا کار پارک تھا... وہاں ان سے پہلے بھی
گاڑیاں تیار کھڑی تھیں... جونہی ان کی گاڑی رکی...
گاڑیوں سے لوگ نکل کر ان کے گرد جمع ہو گئے...

"آپ نے آخر ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟" انور گردیزی
نے منہ بنا کر کہا۔

"ہمیں اس عمارت میں رہنے والے شخص سے ملنا ہے...
اور آپ سب کے سامنے ایک بہت اہم بات اس سے
کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن اس کے لیے... مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"
انور گردیزی نے پھر منہ بنایا۔

"اس لیے کہ جس مجرم کی میں بات کر رہا ہوں... اس
کا تعلق اس لاش سے بھی ہے... جو آپ کے دروازے
پر ملی تھی۔"

"کیا!!!" وہ زور سے اچھلے... چہرے پہ حیرت دوڑ گئی۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اگر بات یہ ہے تو پھر آپ نے اچھا کیا... مجھے بلا

کر..." انھوں نے کہا۔

"شکریہ! آپ نے یہ بات تو کہی... اب ہم دستک دیں گے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اشارہ کیا اور محمود نے گھنٹی بجادی... جلدی دروازہ کھلا اور ایک ملازم باہر نکلا... وہ اتنے بہت سے آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"خیر تو ہے جناب؟"

"صاحب اندر ہیں؟"

"جی ہاں! بالکل ہیں... میں انھیں اطلاع کرتا ہوں۔"

"نہیں... آپ رہنے دیں... ہم اپنی آمد کی اطلاع انھیں خود دیں گے... آپ تو بس ہمارے آگے آگے چلیں۔"

"وہ مجھ پر بگڑیں گے۔"

"کوئی بات نہیں... معاملے کو ہم سنبھال لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا، اور پھر وہ اس کے پیچھے چلتے ایک کمرے تک پہنچ گئے... ملازم نے اشارے سے بتایا کہ اس کمرے میں ہیں... وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے... اچانک ایک آواز کمرے میں گونج اٹھی:

"کیا مطلب... یہ سب کیا ہے؟"

یہ آواز سن کر انسپکٹر جمشید کے سامنے موجود تین آدمی اچھل پڑے... یہ تینوں وہی انسپکٹر تھے... اور اس وقت میک اپ میں تھے... ان کے چہروں پہ میک اپ انسپکٹر جمشید نے خود کیا تھا...

"یہ سب کیا ہے... اس کا جواب انسپکٹر جمشید دیں گے۔" انور گردیزی نے منہ بنا کر کہا۔

"اوہو... آپ بھی ساتھ آئے ہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! مسٹر راجا تنویر... آپ کے جرم سے پردہ اٹھانے کے لیے ہم سب آئے ہیں... انور گردیزی بھی آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب... یہ میں مجرم کب سے ہو گیا؟"

"آپ کی سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ آپ بزرگوں سے کام لیتے رہے... ان سے اپنی اصلی آواز میں بات کرتے رہے... کبھی فون پر آواز بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"کیا مطلب؟"

"اس وقت یہاں تین حضرات ایسے موجود ہیں... جن سے آپ فون پہ بات کرتے رہے ہیں... اپنے جرمانہ

احکامات انھیں دیتے رہے ہیں۔"

"بن... نہیں..." اس نے کہا، اور پھر جلدی جلدی سب لوگوں پر ایک نظر ڈالی... آخر بولا:

"نہیں جناب... ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جس..."

وہ کہتے کہتے رک گیا... اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں... انسپکٹر جمشید نے اس سے اقرارِ جرم کرا لیا تھا... اس جملے کا... ادھورے جملے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجرمانہ احکامات دیتا رہا ہے...

"بہت خوب... بات قطے ہو گئی... جرم تو آپ کا ثابت ہو گیا... مزید اطمینان کے لیے میں ان حضرات کے میک اپ اتارے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ان تینوں کا میک اپ اتار دیا... راجا تنویر ایک بار پھر زور سے اچھلا...

"یہ ہیں سابقہ پولیس انسپکٹر... ان کے ذریعے آپ ایک گھناؤنا جرم کرتے رہے ہیں... کیا آپ کو اپنے جرم سے انکار ہے...؟"

"ہاں! انکار ہے... ان لوگوں کو آپ نے بہلا پھسلا کر میرے خلاف کر ڈالا ہے..." اس نے ہنس کر کہا... لیکن یہ ہنسی کھوکھلی تھی...

سٹر راجا تنویر... میرا خیال ہے... یہ بات چیت کھڑے ہو کر پوری نہیں ہو سکے گی... بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنا ہو گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں آئیے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

وہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا اور بولا:

"میں ذرا چائے وغیرہ کے لیے کہہ آؤں..." یہ کہہ کر اس نے فوراً دروازے کی طرف قدم اٹھا دیے...

"اب آپ کہیں نہیں جا سکتے جناب!" محمود نے اس کے راستے میں آتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کہا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ کہانی شروع سے شروع کرنی پڑے گی... ایک اچھے اور شریف انسان کی کہانی... جب وہ ملازمت تلاش کرتا پھر رہا تھا... لیکن پھر ایک دن اسے پولیس نے پکڑ لیا اور اسے ایک سال کی سزا دلوا دی... وہ باہر نکلا تو مجرم بن چکا تھا... اسے کسی نامعلوم آدمی نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی پیش کش کی، اور پھر وہ اس گروہ میں شامل ہو گیا... اسے شان دار تنخواہ ملنے لگی... اس شریف کا نام ہے... راجا تنویر۔"

پتا نہیں... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مسٹر راجا تنویر... آپ کی انگلیوں کے نشانات اس قلعے سے مل چکے ہیں... جس میں محمود، فاروق اور فرزانہ کو قید کیا گیا تھا... آپ کو خود وہاں جانے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟"

"میں ہرگز وہاں نہیں گیا۔" اس نے چلا کر کہا۔

"آپ نے ان کا جملہ سنا... گویا یہ اس عمارت سے اچھی طرح واقف ہیں... ورنہ میرا جملہ سن کر یہ فوراً کہہ اٹھے... آپ آخر کس عمارت کی بات کر رہے ہیں؟"

"اوہ!" حاضرین کے منہ سے نکلا...

"اس کا مطلب ہے، یہ وہاں گئے ہیں... یا نہیں... لیکن اس عمارت سے ان کا تعلق ضرور ہے... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

سب نے سر ہلا دیے...

"ہاں تو مسٹر راجا تنویر... آپ کا اس عمارت سے کیا تعلق ہے اور تم نے راحیل گردیزی... یعنی اپنے گہرے دوست کو کیوں قتل کیا... اس کا کیا مقصد تھا؟" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"م... میں نے... نہیں... ہرگز نہیں... میں نے یہ جرم

نہیں کیا..." اس نے چلا کر کہا۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے... کہ تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے... یہ گفتگو آپ کے خلاف عدالت میں پیش کی جائے گی... میں آپ سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں... اور وہ یہ کہ ہیروئن کی اس تجارت کا بے تاج بادشاہ کون ہے؟"

"جی... کیا مطلب... یہ ہیروئن کہاں سے نکل آئی؟"

"سارا چکر تو ہیروئن کی تجارت کا ہی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بات کچھ واضح نہیں ہو رہی... کیا یہ مناسب نہیں ہو گا... انسپکٹر جمشید کہ تم تمام معاملات کو ایک ترتیب سے بیان کر دو۔" ایسے میں آئی جی صاحب بول اٹھے۔

"جی بہتر! میں یہ بھی کیے دیتا ہوں..." انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ بہت مدت کی بات ہے... شہر میں جب ہیروئن کا کاروبار نیا نیا شروع کیا گیا تھا... اور کم لوگ اس لعنت میں مبتلا تھے... لیکن یہ دھندا کرنے والے بین الاقوامی گروہ کو ضرورت اس چیز کو پھیلانے کی... عام کرنے... اس کے لیے ان کے پاس کچھ ایسے کام کرنے والے ہونے چاہییں تھے،

جو مستقل طور پر اس گروہ کے لیے کام کریں، اور گروہ کو کبھی
چھوڑنے کا نام تک نہ لیں... اس کے لیے ایک گھناؤنی سکیم
بنائی گئی... اور وہ سکیم یہ تھی کہ کچھ بے گناہ لوگوں کو ہیروئن
فروخت کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جائے... ان پر جرم
ثابت کرایا جائے اور انھیں سزا دلوائی جائے... اس طرح جیل
میں انھیں ہیروئن کا عادی بنایا جائے... وہاں سے جب وہ
نکلیں تو سوائے ان کے اور کسی کام کے نہ رہ جائیں، چنانچہ
اس سلسلے میں چند رشوت خور انسپکٹروں کو گانٹھا گیا... ان
کی باقاعدہ کمیشن مقرر کی گئی... اور وہ اپنا کام کرنے لگے...
اس طرح اس گینگ میں جرائم پیشہ لوگوں کی آمد بڑھتی گئی اور
یہ کاروبار پورے ملک پر چھاتا چلا گیا... اور آج ہم دیکھ سکتے
ہیں... ہیروئن کی تجارت کتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے...
پورے ملک میں ہیروئن فروش دندناتے پھر رہے ہیں... اگر
کہیں کوئی پکڑا بھی جاتا ہے تو اسے بھی چھڑا لیا جاتا ہے،
زیادہ سے زیادہ وہ چند دن کے لیے جیل چلا جاتا ہے...
اس کیس میں جب راحیل کی لاش ملی تو میں نے اپنے
آدمیوں کو اس معاملے کی تفتیش پر لگا دیا اور ان سے رپورٹ
لیتا رہا... وہ اس مکان تک بھی پہنچے... جو راحیل گردیزی
نے خریدا تھا... انھوں نے یہ پتا چلانے کی کوشش کی کہ مکان

پہلے کس کا تھا... انھیں معلوم ہوا... وہ مکان کسی ارشاد احمد کا
تھا... ارشاد احمد کے بارے میں جب معلومات حاصل کی گئیں
تو پتا چلا... وہ ہیروئن فروشی کا دھندا کرتا تھا... اور جب اس
کے ماضی میں جھانکا گیا تو معلوم ہوا کہ پھرتے ہوئے اسے ایک
دن ایک پولیس انسپکٹر نے پکڑ لیا تھا... اور اس پر ہیروئن
فروشی کا جرم ثابت کر دیا گیا تھا... اسے شاید دو سال کی
سزا ہوئی تھی... جیل سے جب نکلا... تو اس کے بعد باقاعدہ
ہیروئن فروش بن گیا... سنا ہے... پھر اس نے اس قدر ترقی
کی کہ گینگ کا نائب باس بن گیا اور باس کے مرنے کے بعد
اسے باس چن لیا گیا... لیکن ایک دن اس کی لاش سڑک
پر سے ملی... جب تفتیش کی گئی تو پچھلی ساری کہانی اخبارات
میں شائع ہوئی... کہ کس طرح ہیروئن فروشی کے جرم میں وہ
پہلی مرتبہ جیل گیا تھا... موقعے پر پکڑے جانے والے کچھ
ہیروئن فروش تھے... اس کی لاش کو شناخت کیا تھا، اور
یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ یہی گینگ کا باس تھا... بہرحال
کہنے کا مطلب یہ کہ اس طرح اس کے مکان کا سراغ لگا لیا
گیا اور اس وقت یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ مکان کئی سال
سے لاوارث پڑا تھا... اس کے مرنے کے بعد کوئی مکان
کا وارث سامنے نہیں آیا تھا... لہٰذا سرکاری طور پر اس

کو فروخت کرنے کا اعلان کیا گیا اور اتفاق کی بات کہ لیں...
یا اس میں انور گردیزی صاحب کی کوشش کا دخل ہو گا کہ
اس کی نیلامی راحیل کے نام چھوٹ گئی... راحیل کے گھر والوں
نے بتایا ہے کہ وہ گھر سے نئے مکان کا جائزہ لینے گئے
تھے... تاکہ وہاں جو کام کرانے کی ضرورت ہو... وہ کرا لیں...
لیکن وہ گھر نہیں آئے... مکان سے ضرور گئے... کیوں کہ ان کی
انگلیوں کے نشانات وہاں سے ملے ہیں... میرا ذہن کہتا ہے،
ان کے ہاتھ ارشاد عرف ارشادے کی کوئی چیز لگ گئی ہو
گی... ہو سکتا ہے، کوئی ڈائری... یا کوئی اور چیز... جس
سے اسے نہ صرف ارشاد کی حقیقت معلوم ہو گئی ہو گی بلکہ...
اس ڈائری یا اس چیز کی وجہ سے موجودہ باس کے بارے
میں بھی کچھ اشارے مل گئے ہوں گے، یا صاف طور پر
پتا چل گیا ہو گا... اب اس کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا،
اصل سوال یہ ہے... ڈائری یا کوئی دوسری چیز مل گئی تو
انھوں نے کیا کیا... وہ... وہ سیدھے اپنے دوست کے
پاس آئے اور اسے بتا دیا کہ وہ اس کے بارے میں سب
کچھ جان چکے ہیں... یا پھر... کہیں اور گئے... آخر مجرم کو
کس طرح معلوم ہوا کہ انھیں اس کے بارے میں سب کچھ
معلوم ہو چکا ہے... اس سوال کا ایک ہی جواب ذہن

ں آتا ہے... اور وہ یہ کہ وہ سیدھے راجا تنویر صاحب
کے پاس آئے... کیوں کہ وہ ان کے دوست تھے... گہرے
ست..." انسپکٹر جمشید یہ کہہ کر رکے۔
"اور اپنے دوست سے آ کر کہا کہ تم ہی وہ شخص ہو،
اتنے بڑے گینگ کو چلا رہا ہے... ہیروئن کا یہ گھناؤنا
اروبار تمھارے ذریعے پھیل رہا ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔
"بالکل یہی بات ہے... اور مسٹر راجا تنویر... جب آپ
دیکھا کہ اس ڈائری کے ذریعے تم بالکل بے نقاب ہو
اؤ گے... اور تم کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکو گے،
تم نے بے چارے راحیل گردیزی کو گولی مار دی۔"
"ن... نہیں... نہیں... نہیں۔" راجا تنویر چلا اٹھا۔
"نہیں... کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔
"مطلب یہ کہ میں نے اسے گولی نہیں ماری... بالکل
ہیں ماری۔"
"تو کیا یہ بھی غلط ہے... کہ راحیل گردیزی ڈائری لے
تمھارے پاس آیا تھا؟"
"ہاں! وہ آیا تھا۔" اس نے چیخ کر کہا۔
"بہت خوب! اور اس کے پاس ڈائری تھی... جو
شاد عرف ارشادے نے لکھی تھی... اپنے مجرم بننے کی ساری

داستان اس نے لکھی تھی۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"مسٹر راجا تنویر... آپ نے اس سے پہلے جو گفتگو کی... اس سے آپ کا اس گروہ میں شریک ہونا تو پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے... قلعہ نما عمارت سے ملنے والے انگلیوں کے نشانات بھی اس بات کا ثبوت ہیں... اگرچہ آپ کا کہنا یہ ہے کہ آپ وہاں نہیں گئے... ہو سکتا ہے... آپ محمود، فاروق وغیرہ کے قید ہونے کے دوران وہاں نہ گئے ہوں... لیکن اس سے پہلے وہاں ضرور جاتے رہے ہیں... دوسرے یہ کہ وہاں کی کرسیوں اور میزوں پر سے بے شمار لوگوں کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں... اس کا مطلب ہے... وہاں ان گنت لوگ جمع ہوتے رہے ہیں... گویا وہاں ماہانہ یا پندرہ روز بعد باس آتا رہا ہے... وہاں پروگرام ترتیب دیے جاتے رہے ہیں... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"تو کیا آپ اقرار کرتے ہیں... کہ اس گینگ کے سرغنہ یعنی باس آپ ہی ہیں؟"

"نہیں! میں باس نہیں ہوں۔"

"شکریہ! باس کون ہے۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"کیا مطلب... تو کیا آپ بھی باس کو نہیں جانتے؟"

"ہاں نہیں جانتا... کوئی بھی نہیں جانتا... کہ باس کون ہے۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"لیکن میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا... کم از کم ایک آدمی ضرور جانتا ہو گا کہ موجودہ باس کون ہے۔"

"یہ بات آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"اس کی وجہ ہے... یا تو باس آپ خود ہیں... یا پھر آپ باس سے واقف ہیں... ان دو میں سے ایک بات ضرور ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اور میں کہتا ہوں... یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"خیر! میں اپنی بات ثابت کروں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب... آپ یہ بات ثابت کریں گے کہ یا تو میں باس ہوں... یا پھر باس سے واقف ہوں۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"ہاں! بالکل ثابت کروں گا۔"

"اچھا تو پھر کریں" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔
"آپ یہ اقرار کر چکے ہیں... کہ راجا تنویر ارشاد احمد کی ڈائری
لے کر آپ کے پاس آیا تھا؟"
"ہاں! یہ ٹھیک ہے" اس نے فوراً کہا۔
"اس ڈائری میں باس کا نام لکھا تھا؟"
"نہیں!" اس نے فوراً کہا۔
"اس ڈائری میں باس کا نام نہیں تھا تو پھر اس ڈائری
سے باس کو یا آپ کو کیا خطرہ پیدا ہو گیا تھا... کہ غریب
راحیل کو راستے سے ہٹا دیا گیا"
"اس میں طریقہ کار کی وضاحت تو تھی نا... اس راز
کا کھل جانا بھی ہمارے لیے نقصان دہ تھا... اور پھر
میں بھی تو قانون کی نظروں میں آ جاتا"
"لہذا آپ نے راحیل کو ختم کر دیا"
"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں... کہ میں نے اسے ختم نہیں
کیا" اس نے چیخ کر کہا۔
"سن رہے ہیں حاضرین... یہ کس قدر بے وقوفانہ بات
کر رہے ہیں... ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ راحیل ان کے
پاس وہ ڈائری لے کر آیا تھا... جس میں گینگ کا راز لکھا
گیا تھا... دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اس ڈائری میں باس

نام نہیں تھا... البتہ ان کا نام تھا... گویا انھیں تو خطرہ تھا،
باس کو نہیں تھا... کیوں کہ یہ باس کو نہیں جانتے... لیکن
ساتھ ہی کہتے ہیں کہ قتل انھوں نے نہیں کیا... اب ان کی
کون سی بات درست مانی جائے اور کون سی غلط... اگر
ڈائری میں باس کا نام نہیں تھا... اور یہ باس کو جانتے
بھی نہیں، تو پھر یہ قاتل ہیں... کیوں کہ اس صورت میں یہ
اس باس کے پاس تو بھیج ہی نہیں سکتے تھے... اور خود
انھیں خطرہ پڑ گیا تھا... لہذا ان کے لیے یہ ضروری ہو
گیا تھا کہ راحیل کو ختم کر دیں... جب کہ ان کا بیان یہ
ہے کہ انھوں نے قتل نہیں کیا... تو پھر آخر وہ قتل کس
نے کیا ہے... اور اگر یہ قتل کسی غیر متعلق آدمی نے کیا
ہے تو پھر ڈائری کی اس غیر متعلق آدمی کو کیا ضرورت تھی،
لہذا غیر متعلق آدمی کو تو قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں
تھی... راحیل کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی... نہ اس
کا کسی سے کوئی کاروباری یا کسی بھی قسم کا جھگڑا تھا،
وہ نہایت صلح پسند، امن پسند اور بہت ہی نیک انسان
تھا... کسی کو اسے قتل کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں
تھی... لہذا مسٹر راجا تنویر کو یہ بات ماننا ہو گی... یا
تو یہ قتل انھوں نے خود کیا ہے... یا پھر ڈائری میں

باس کا نام تھا... اور راحیل باس کے پاس گیا تھا... لیکن اس
نے راحیل کو قتل کرا دیا... اور قتل کرا کے لاش انور گردیزی
کی کوٹھی کے دروازے پر ڈال دی... تاکہ اس کی طرف
کسی کا دھیان تک نہ جائے... چنانچہ اب مسٹر راجا تیز
آپ کو باس کا نام بتانا ہو گا... یہ اس کیس کا سب
سے اہم موڑ ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں... ڈائری میں باس کا نام نہیں تھا
اور نہ میں جانتا ہوں کہ باس کون ہے۔" اس نے جھلا
کر کہا۔

"اگر ہم یہ مان لیں کہ ڈائری میں باس کا نام نہیں
تھا... اور آپ بھی باس کو نہیں جانتے تو پھر آپ کے
پاس سے راحیل گردیزی اپنے انکل انور گردیزی کے
پاس کیوں گئے... یہ آپ مجھے بتا دیں... اور آپ نے
انھیں جانے کس طرح دیا... جب کہ آپ تو اس طرح
پھنس ہی رہے تھے..." انسپکٹر جمشید کا لہجہ پُرزور ہو گیا۔

"وہ... میں... میں..." اس سے کوئی جواب نہ
جڑ سکا۔

"آپ نہیں گئے... آپ کے پاس اب سچ اگل دینے
کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

کرے میں موجود تمام لوگ حد درجے دلچسپی سے یہ ساری
سنتے رہے تھے... ایسے میں انور گردیزی صاحب نے
:

ثابت ہو گیا کہ یہ حضرت اس کاروبار کی پشت پر ہیں،
یں گرفتار کر لیا جائے۔"

لیکن مشکل یہ ہے کہ... ان کے خلاف راحیل کے
کا ثبوت ہم حاصل نہیں کر سکے۔" انسپکٹر جمشید نے بےچارگی
عالم میں کہا۔

"اور میں کہتا ہوں... یہ قتل میں نے نہیں کیا۔"

"تو پھر... آخر کس نے قتل کیا ہے؟"

"باس نے۔" اس نے کہا۔

"راحیل باس تک کیسے پہنچا؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"وہ باس تک نہیں گیا... وہ تو مجھ پر گرج برس کر
پنے انکل کو ساری کہانی سنانے گیا تھا... یہ کہہ کر کہ اس
کے انکل وزیر داخلہ کے سیکرٹری ہیں... وہ اس سارے
ینگ کو پکڑوا دیں گے... میں نے جب یہ دیکھا کہ کام
راب ہو رہا ہے... تو باس کو اطلاع دے دی۔"

"بہت خوب! آپ نے سچ بات بتائی ہے... تو آپ
کے باس کا نام، پتا اور فون نمبر معلوم ہوا نا۔"

"نہیں... مجھے اس کا نام معلوم نہیں، نہ پتا معلوم ہے
فون نمبر بھی معلوم نہیں... لیکن میں ان سے وائرلیس
سیٹ پر بات کرتا ہوں... وہ سیٹ مجھے انھوں نے
ہی بھجوایا تھا۔"

"بہت خوب... ہو سکتا ہے یہی بات ہو... لیکن اس
بات کا بھی امکان ہے کہ آپ کو باس کا نام معلوم ہو"
انھوں نے کہا۔

"آپ امکان سے نہیں... ثبوت سے بات کریں۔" اس
نے بھنا کر کہا۔

"اچھی بات ہے... میں اس بات کا ثبوت بھی پیش
کروں گا کہ آپ کو باس کا نام معلوم ہے... اکرام...
جب سے ہم نے ان کی نگرانی شروع کی ہے... ان کی
سرگرمیوں کی رپورٹ پڑھ کر سنا دو۔" وہ اکرام کی
طرف مڑے۔

"کیا مطلب؟" وہ زور سے چونکا۔

"مطلب یہ کہ جب سے ہمیں آپ پر شک ہوا تھا...
آپ کی نہایت خفیہ انداز میں نگرانی شروع کر دی گئی
تھی... نہ صرف نگرانی... بلکہ آپ وائرلیس سیٹ پر جو
گفتگو کرتے رہے ہیں... اس کے ٹیپ کرنے کا انتظام

...ہم نے کر لیا تھا... ہمارے پروفیسر داؤد آخر ہیں کس
...ں کی دوا... یہی کام تو وہ کرتے ہیں... وائرلیس سیٹوں
...فریکوئنسی اپنے آلات کے ذریعے کیچ کر لینا ان کے
...ئیں ہاتھ کا کام ہے... ایسے موقعوں پر اکرام ان سے
...بطہ قائم کرتا ہے... لہذا ہم آپ کی اور باس کی گفتگو
...یکارڈ کر چکے ہیں۔"

"...ن... نہیں..." اس مرتبہ اچھلنے والا صرف راجا تنویر نہیں
...ری اور بھی تھا... لیکن اس کا اچھلنا سب نہ دیکھ سکے،
...ں کہ سب کی توجہ تو راجا تنویر کی طرف تھی...

"...یہ... یہ جھوٹ ہے... غلط ہے... آپ اس خاص
...وائرلیس سیٹ کی بات چیت ریکارڈ نہیں کر سکتے تھے۔"

"...اس کا مطلب ہے... آپ نے بات چیت تو باس
...ے کی ہے۔"

"...یہ اقرار تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

"...تب پھر آپ کے گھر میں گونجنے والی آواز... جو کہ
...باس کی تھی... وہ بھی ریکارڈ کی گئی ہے... آپ کے
...کرے میں اکرام کے ایک ماتحت نے بجلی کی خرابی دور
...کرنے کے بہانے ایک آلہ فٹ کیا تھا... دو دن پہلے
...آپ کے گھر کے اندر بجلی میں کوئی خرابی واقع ہو گئی

تھی... ہو گئی تھی یا نہیں ... آپ نے الیکٹریشن کو فون کیا
تھا ... جب الیکٹریشن آپ کے گھر کے پاس پہنچا تو اکرام
کے آدمیوں نے اسے تو واپس لوٹا دیا ... اور ان میں سے
آپ الیکٹریشن کے روپ میں آپ کے گھر پہنچ گیا ... اور
وہ آلہ فٹ کر آیا ... بعد میں اسی ترکیب سے آج ہی
وہ آلہ واپس حاصل کر لیا گیا ہے ... اور ریکارڈ شدہ گفتگو
اس میں موجود ہے ... اور اس میں جو باس کی آواز ہے،
وہ بدلی ہوئی بھی نہیں ہے ... بالکل اصل ہے .... کیا
خیال ہے ... آپ سب لوگ وہ آواز سننا پسند کریں گے؟"
انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ضرور کیوں نہیں ... ہم سب کا تو مارے بے قراری
کے بُرا حال ہے ... ہم تو چاہتے ہیں ... آپ جلد از جلد
اس قصے کو ختم کر دیں بس" ایک آفیسر بولے۔

"جی ... بس ... اب چند منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا"
انھوں نے کہا اور اکرام کو فون کیا ... اس نے ٹیپ ریکارڈ
پر آوازیں سنانے کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا ... لہذا
صرف ایک بٹن دبا دیا ... کمرے میں پہلے سرر سرر کی آواز
سنائی دیتی رہی ... پھر ایک آواز گونجی ... اور وہ آواز
راجا تورید کی تھی ...

"ہیلو باس ... ہیلو ... فوری توجہ"
یہ جملہ کہنے کے بعد پھر سرر سرر کی آواز سنائی دینے
لگی ... ایک منٹ بعد آواز پھر گونجی:

"ہیلو باس ... ہیلو ... فوری توجہ"
اب بھی جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی ... سب نے
پریشان ہو کر اکرام کی طرف دیکھا ... وہ مسکرایا:

"فکر نہ کریں ... جب باس وائرلیس سیٹ پر آئے گا، تبھی
جواب دے گا نا ... ابھی توجہ صاحب باس کو سیٹ کی
طرف بلا رہے ہیں"

"اوہ اچھا"
اچانک ایک آواز سیٹ پر ابھری:

"ہاں راجا ... کیا بات ہے"
اس کی آواز سن کر سبھی بری طرح اچھلے ....

اجازت

"انسپکٹر جمشید کی تفتیش بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے... کم از کم میں تو ان کی نظروں میں آ ہی چکا ہوں۔"

"فکر کی ضرورت نہیں... اس کا کانٹا نکال دیا جائے گا۔" باس کی آواز ابھری۔

"لیکن کیا باس... جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا۔" راجا تنویر کی آواز تھی۔

"نہیں... اس سے بہت پہلے... میں ابھی اس کی موت کا حکم صادر کر رہا ہوں... ایک دو دن میں شہر کی کسی سڑک پر اس کی لاش مل جائے گی۔"

"آپ کا بھتیجا مر کر بھی ہمیں لے بیٹھا... آخر آپ کو کیا ضرورت تھی... اسے اپنی کوٹھی کے دروازے پر ہلاک کروانے کی..." راجا تنویر کے لہجے سے ناخوش گواری جھلک

رہی تھی...

"میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا... میں نے تو صرف یہ اطلاع دی تھی کہ اس وقت راحیل گردیزی، انور گردیزی سے ملاقات کرنے گیا ہوا ہے... اس ملاقات سے واپس لوٹتے ہی اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے... اب ان لوگوں کو یہ تو معلوم نہیں کہ باس میں ہی ہوں... لہٰذا انھوں نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا... اسی وقت سے میں اس کوشش میں لگ گیا کہ انسپکٹر جمشید اس طرف توجہ نہ دے سکے... دوسری طرف اسے بلانا بھی ضروری ہو گیا تھا... کیوں کہ یہ بات بہت مشہور ہے کہ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں... اور اس کے علاوہ کسی کو قابلِ اعتماد نہیں خیال کرتا... لہٰذا یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ میرے دروازے پر قتل کی واردات ہو جائے اور میں تفتیش کے لیے اس کے علاوہ کسی اور کو بلاؤں... لہٰذا فوری طور پر اس قسم کے انتظامات کیے گئے کہ بلانے کے باوجود وہ نہ آ سکے... لیکن افسوس! آئے بغیر وہ پھر بھی نہ رہا... خیر تم فکر نہ کرو... اب اس کی زندگی کے یہ آخری گھنٹے سمجھو... بہت جی لیا وہ۔"

"شکریہ باس... یہی میں چاہتا ہوں... لیکن باس... کی صرف اس کے مر جانے سے ہم بچ جائیں گے..."

اس کے پیچھے بھی تو شیطان کے چیلے ہیں۔"
"ان کا بھی بعد میں کانٹا نکال دیا جائے گا۔" باس
نے کہا۔

"بہت خوب... اب میں بے فکری سے سو سکوں گا۔"
"نہیں نہیں مسٹر انور گردیزی... آپ پستول نہیں نکال
سکتے... میں آپ کی گردن سے صرف نصف انچ کے فاصلے
پر پستول کی نال رکھے ہوئے کھڑا ہوں۔"
ان سب نے خان رحمان کی آواز سنی...
"ہاں خان رحمان... بالکل ٹھیک... اکرام اور دوسرے
آفیسر تو اس پر پستول نہیں تان سکتے... کیوں کہ یہ حضرت
وزیر داخلہ کے مشیر ہیں... لیکن تم ضرور پستول تان سکتے ہو،
اور ہمارے خاص آدمی اسے ہتھکڑی پہنائیں گے... کیونکہ میرے
پاس بہرحال اس کا اختیار ہے کہ میں مشیر تو کیا... وزیر کو
بھی گرفتار کر سکتا ہوں... شرط یہ ہے کہ وطن دشمن اور
ہیروئن کے سوداگر سے بڑھ کر وطن دشمن ہو کون سکتا ہے،
اور یہ حضرت تو ہیروئن کا صرف سوداگر ہی نہیں... ہیروئن
کا بے تاج بادشاہ ہے... آج کا دن اس لیے بہت خوشی
کا دن ہے کہ ہم نے ہیروئن کے سب سے بڑے شخص پر
ڈالا ہے... کم از کم ہمارے ملک کی سطح تک یہ سب

ے بڑا ہے... اور آج سے نہیں... نہ جانے کتنے عرصے
ے یہ باس چلا آ رہا ہے... ابھی ہم اس کے گھر سے
وہ ڈائری بھی برآمد کریں گے... جو اس نے راحیل گردیزی
ے حاصل کی تھی... دراصل راحیل گردیزی ڈائری لے کر
راجا تنویر کے پاس آیا تھا... کیوں کہ وہ اس کا دوست تھا،
راجا تنویر نے جب اس ڈائری کا مطالعہ کیا تو وہ گھبرا گیا...
کیوں کہ اس میں اگرچہ اس کا نام نہیں تھا... انور گردیزی
کا نام تھا... اور سابقہ سارے حالات اور واقعات درج
تھے کہ وہ یعنی ارشاد کس طرح ہیروئن کا باس بنا... اور
پھر کس طرح اس نے یہ دھندا چھوڑ دیا... ڈائری کے آخری
الفاظ یہ تھے کہ اب موجودہ باس انور گردیزی ہے... وہ پہلے
اس گینگ میں اس کا نائب تھا... اس کے بعد ظاہر ہے،
نائب ہی بادشاہ بن سکتا تھا... اور یہی ارشاد کو ختم کرانے
والا ہے... لیکن اس کی بدقسمتی... اس نے ارشاد کو مروا
تو دیا... اس کے مکان کی تلاشی لینے کی اس نے ضرورت
محسوس نہ کی... مکان بہت عرصے تک بند پڑا رہا... اور پھر
حکومت نے جب اسے نیلام کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا اپنا
بھتیجا اسے خریدنے پر تل گیا... اس سلسلے میں اس نے انور
گردیزی سے ملاقات کی اور اس نے اپنی کوشش سے نیلامی

اس کے نام چھڑوائی... یہ نہیں جانتا تھا... یہ بولی... اس کی زندگی کی بولی ثابت ہو گی؟" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید رک گئے۔

کمرے میں سکتہ طاری ہو گیا... ہر کوئی بت بنا بیٹھا تھا... یوں لگتا تھا جیسے ان میں سے کسی کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہ رہ گیا ہو... آخر آئی جی صاحب بولے:

"یہی وجہ تھی کہ ملک سے ہیروئن کا کام ختم نہیں ہو رہا تھا... چھوٹے موٹے لوگ پکڑے جاتے تھے... ان کے پکڑے جانے سے گینگ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا... اور باس تک کوئی پہنچا ہی نہیں تھا... یہ حضرت تو ان لوگوں کو بچانے کے چکر میں رہتے ہوں گے... نہ جانے کتنوں کو انھوں نے اپنی کوششوں سے چھڑایا ہو گا۔"

"اب سوال یہ ہے کہ ان حضرت کو ہتھکڑی کون پہنائے گا۔" آئی جی بولے۔

"میرے سوا کون یہ ہمت کرے گا۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اس کی طرف بڑھے... عین اسی وقت اس نے پاؤں زمین پر دے مارا... خان رحمان گھبرا گئے... فائر نہ کر سکے... کیوں کہ سامنے سے انسپکٹر جمشید چلے آ رہے تھے... اور پھر دھواں اس قدر تیزی سے پھیلا کہ پورے

ے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا... ساتھ ہی وہ گرتے چلے گئے ن انسپکٹر جمشید تھے... جو بے ہوش نہیں ہوئے تھے، انھوں نے بلا کی رفتار سے دروازے کے باہر چھلانگ لگائی... ہی وہ دروازے کے باہر گرے... ان کے سر پر ایک زبردست وٹ لگائی گئی:

"میں جانتا تھا بچو... تم بے ہوش نہیں ہو گے... لہٰذا باہر نکلتے ہی یہاں رک گیا تھا۔"

بے ہوش ہونے سے پہلے انھوں نے یہ الفاظ سنے... پھر ان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا... ہوش میں آئے تو سب کے سب ہسپتال کے ہال میں بستروں پر تھے...

"یہ کیا ہوا ابا جان؟"

"بھئی... بس... چوک ہو گئی... ہم زیادہ سے زیادہ اس خیال میں تھے کہ وہ پستول نکالنے کی کوشش کرے گا... اس غرض کے لیے خان رحمان چوکس تھے... لیکن ہم یہ بھول گئے کہ وہ آخر ہیروئن کے کاروبار کا بے تاج بادشاہ ہے، اور وہ اپنے ساتھ دھوئیں کا بم بھی لا سکتا ہے۔"

"اب اسے تلاش کرنا بہت مشکل کام ثابت ہو جائے گا۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں! ہو تو جائے گا... لیکن بھئی... ہم کر ہی کیا سکتے

ہیں:" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"صبر!" فاروق نے فوراً کہا۔

"شوق سے کرو صبر... تمہیں روکا کس نے ہے۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"ہسپتال میں جلنا بھنتا نہیں ہے... آگ لگ جاتی ہے۔" فاروق ہنسا۔

"اچھا بھلا مجرم ہاتھ آگیا تھا... افسوس۔" فرزانہ نے کہا۔

"ارے بھئی... تو پھر آ جائے گا..." انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آخر اب کس طرح ہمارے ہاتھ آجائے گا... اب تک تو وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"فکر کی ضرورت نہیں... تم جانتے ہی ہو... میں کچا ہاتھ نہیں ڈالا کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"دھوئیں کے بم سے ہم سب کو بے ہوش کر کے... اس نے یہ خیال کیا کہ وہ اب نہایت آسانی سے ملک سے باہر جا سکے گا... کیوں کہ اس کا راز ابھی اس کمرے سے باہر نہیں گیا... لہٰذا ایر پورٹ پر اسے کون روکے گا... اسے تو نہایت وقار کے ساتھ رخصت کیا جائے گا... لہٰذا

اس نے وہاں سے سیدھا ایر پورٹ کا رخ کیا ہوگا... کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"اس میں کیا شک ہے..." فرزانہ نے کہا۔

"تو پھر جس میں شک ہے... وہ بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" فاروق بولا۔

"اب میں اس فضول ترین اور بے موقع ترین بات کا کیا جواب دوں۔"

"تو کر اور ترین تو نہیں رہ گیا۔" فاروق جل گیا۔

"سنو... اس نے ایر پورٹ کا رخ کیا ہوگا... اور گرفتار کر لیا گیا ہوگا۔"

"جی... کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"میں ایسے انتظامات کرنے کے بعد اتنے بڑے مجرموں کو پکڑنے کے لیے نکلا کرتا ہوں... اسے جہاز پر بیٹھنے نہیں دیا جائے گا... بلکہ اسے تو وہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا ہوگا اور اب ہسپتال لایا جا رہا ہوگا... کیونکہ وہاں میرے خاص آدمی پہلے ہی موجود تھے... اور اس کمرے میں ہونے والی کارروائی کو پوری طرح ساتھ ساتھ سن رہے تھے، وہ جہاں بھی جاتا... اسے دیکھ لیا جاتا۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"دھت تیرے کی... ہم بلاوجہ ہی پریشان ہوتے رہے..."
محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا، اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"یہ دھت تیرے کی کے ساتھ چیخ سمجھ میں نہیں آئی۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تمھاری سمجھ میں پہلے کوئی بات آئی ہے کبھی۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"میری ران پر بے ہوش ہوتے وقت شاید کوئی چوٹ لگ گئی ہے... مجھے اس کا خیال نہیں رہا... ہاتھ چوٹ پر لگا... چیختا نہ، تو کیا کرتا۔"

"اوہ! تب تو تم شوق سے چیخ سکتے ہو... ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"کس بات پر کس کو کیا اعتراض نہیں..." پروفیسر داؤد نے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

"جی وہ... ارے آپ اب ہوش میں آئے ہیں... سب سے بعد میں۔" فاروق نے چونک کر کہا۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں... دھواں زیادہ اندر پہنچ گیا ہو گا۔" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا، پھر چونک کر بولے:

"ہائیں... یعنی کہ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"اوہ جی... ہاں... وہ یعنی کہ... ہم محمود کو چیخنے کی اجازت دے رہے تھے۔"

"چیخنے کی اجازت... یہ کیسی اجازت ہوئی بھئی..." ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا... انھوں نے دیکھا... مجرم ان کے خاص ماتحتوں کے درمیان چلا آ رہا تھا...